معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپیے فی شمارہ سات روپیے

پاکستان میں سالانہ دوسو روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیےٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

جلد ۱۶۱ ماہ ذیقعدہ ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۸ء عدد ۳

فہرست مضامین

شذرات

۱۹۹۷ء میں دار المصنفین شبلی اکیڈمی نے دو نئی کتابیں شایع کی تھیں، تذکرۃ الفقہا حصہ اول اور شذرات سلیمانی حصہ دوم۔ اب ۱۹۹۸ء میں ایک نئی کتاب مولانا ابو الکلام آزاد، مذہبی افکار، صحافت اور قومی جد و جہد چھپی ہے، قدر دانوں کو یہ تینوں کتابیں مکتبۂ دار المصنفین سے مل سکتی ہیں۔

گزشتہ سال سات پرانی کتابوں کے نئے اڈیشن بھی نکلے تھے، دار المصنفین کی کئی کتابیں مدارس اور اسکولوں کے نصاب میں داخل ہیں مگر پلیٹیں گھس جانے کی وجہ سے ان کی چھپائی بہت خراب ہو رہی تھی اور برابر شکایت نامے موصول ہوتے تھے اس کی تلافی کے لیے ان کے کمپیوٹر سے کتابت شدہ صاف اور صحیح اڈیشن شایع کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے اور گزشتہ سال مختصر تاریخ ہند شایع کی گئی، ہندوستان کی کہانی اور تاریخ اسلام حصہ دوم کی کمپیوٹر کتابت ہو چکی ہے، سیرۃ النبی حصہ سوم کی طباعت ہونے والی ہے اور سیرۃ النعمان کمپوزنگ کے آخری مرحلے میں ہے، الانتقاد علی التمدن الاسلامی، تاریخ ارض القرآن اور انقلاب الامم کی تصحیح و مراجعت کی جا چکی ہے۔ ان کی اور سیرۃ النبی حصہ چہارم اور تاریخ اسلام کے بقیہ حصوں، تاریخ فقہ اسلامی اور ہماری بادشاہی کی کمپوزنگ بھی پروگرام میں شامل ہے، موخر الذکر تینوں کتابیں کورس میں داخل ہیں۔

یکبارگی ان سب کتابوں کی طباعت کا بار اٹھانا دار المصنفین کے لیے دشوار ہے، ان صفحات میں انکی بھی طباعت کے مصارف کے لیے کئی بار اپیل کی جا چکی ہے، خدا کا شکر ہے کہ سیرت کے دو حصے اور الغزالی کی اشاعت کا سامان اس طرح ہو گیا اور پروفیسر ڈاکٹر مقبول احمد صاحب کلکتہ خود انقلاب الامم اور ان کے توسط سے ایک صاحب خیر ہندوستان کی کہانی کے اخراجات کے متکفل ہو گئے ہیں، ڈاکٹر صاحب اس مہم میں مزید تیزی لانے کے لیے ایک چھوٹے جنریٹر کا انتظام بھی کر رہے ہیں ایک عزیز دوست نے جن کے نام کا اعلان بعد میں کیا جائیگا ارض القرآن کی طباعت کے مصارف کی

ذمہ داری قبول کر لی ہے لیکن زیادہ اہم مسئلہ سیرۃ النبی کی باقی جلدوں کا ہے، حصہ سوم کی طباعت شروع ہو رہی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک شیدائی اور عزیز نے جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے اس کے لیے دس ہزار کا چیک بھیجا ہے مگر ابھی تقریباً اس پر ایک لاکھ مزید خرچ ہوں گے، اس میں عجلت ضروری ہے تاکہ معطی کے نام کا ذکر دیباچہ میں آجائے، جو لوگ علامہ شبلی کی تصنیفات کی اشاعت میں حصہ لینا چاہتے ہوں وہ الانتقاد، سیرۃ النعمان، اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر، سوانح مولانا روم، سفرنامہ روم و مصر و شام، کلیات شبلی فارسی اور موازنہ انیس و دبیر میں سے کسی کتاب کی اشاعت کا ذمہ لے سکتے ہیں۔

دار المصنفین کے ایک مخلص کرم فرما اور ہمارے بزرگ مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی بمبئی سخت علیل ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ صحت یاب ہو کر اپنے وطن تشریف لائے تو اپنی آمد کی خبر ہم کو نہ ہونے دی اور خود ہی سبقت فرما کر اپنے صاحبزادے حکیم فیاض عالم اور بھتیجے جناب فخر عالم کے ہمراہ یہاں تشریف لائے اور ہمیں ممنون کرم کیا اور دار المصنفین کے بعض منصوبوں کی تکمیل میں مدد کرنے کا وعدہ کیا، اللہ تعالیٰ انکی عمر و صحت میں برکت عطا کرے آمین۔ حکیم فیاض عالم صاحب لائف ممبر بنے اور فخر عالم صاحب نے بھی اسکے لیے مادگی ظاہر کی۔

فروری کا معارف چھپ چکا تھا کہ پروفیسر حبیب الحق ندوی کے انتقال کی اندوہ ناک خبر ملی۔ وہ باڑھ (پٹنہ) کے سادات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں میری طالب علمی کے زمانے میں انکے دو چھوٹے بھائی بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے جن سے ملنے کبھی کبھی حبیب الحق صاحب بھی آجاتے تھے، وہ خود بھی یہاں زیر تعلیم رہ چکے تھے پھر پاکستان چلے گئے اور عرصہ سے جنوبی افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی سے وابستہ تھے، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ سے بیعت تھے ان سے ملنے لکھنؤ آتے رہتے تھے اسی سلسلے میں ایک دفعہ سال گزشتہ دار المصنفین بھی پہنچے، لکھنؤ سے اعظم گڈھ کا یہ سفر بڑا مشقت طلب رہا مگر دار المصنفین کو دیکھتے ہی انکی ساری کلفت دور ہو گئی، سرائمیر جانے کی خواہش کی جہاں کی سادگی اور اپنے زمانہ کے استاذوں کے ایثار و قناعت کے بڑے مداح تھے ایک اور دفعہ ندوۃ العلماء میں روس کی آزاد مسلم ریاستوں کے بارے میں ان

ان کا پُر از معلومات خطبہ سُنا تو انہیں اعظم گڈھ آنے کی دعوت دی، یہاں بھی ان کی تقریر بہت پسند کی گئی جس سے ان کے علم و مطالعہ کی وسعت، حالات حاضرہ سے باخبری اور ملی درد کا اندازہ ہوتا تھا دار المصنفین سے ان کو قلبی لگاؤ تھا، معارف پابندی سے پڑھتے، اس میں ان کے مضامین اور خطوط بھی شایع ہوتے تھے، اپنا سہ ماہی انگریزی رسالہ اور تمام کتابیں یہاں بھیجتے، ادھر عرصے سے ان کا حال معلوم نہیں ہوا تھا کہ دفعتاً ان کے ارتحال کی خبر آگئی، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور متعلقین کو صبر و شکیب بخشے آمین !!

فروری ہی میں دار المصنفین کے پریس کے منصرم منشی عتیق احمد صاحب نے لکھنؤ میں داعی اجل کو لبیک کہا، ان کے والد بزرگوار منشی صدیق احمد صاحب بھی جو مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے حقیقی بھانجے تھے، پریس کے انچارج رہ کر عرصہ تک دار المصنفین کی خدمت کرتے رہے، منشی عتیق احمد کو دمہ کا موذی مرض تھا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا، دار المصنفین میں وہ مولانا مسعود علی ندوی کے خاندان کی آخری یادگار تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین!

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ معلوم ہوا کہ جناب ایم حبیب خاں بھی رحلت فرما گئے، وہ انجمن ترقی اردو ہند کے اسسٹنٹ سکریٹری اور جناب خلیق انجم جنرل سکریٹری کے دست راست تھے، نیک طبع اور شریف انسان تھے، جب بھی ملاقات ہوتی تو اپنے خلوص و محبت کا نقش دل پر بٹھا دیتے، دار المصنفین سے بھی لگاؤ رکھتے، گزشتہ برس لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تو دیر تک اس کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے رہے، مدت دراز سے انجمن سے وابستہ تھے، ادب و تنقید ان کا خاص موضوع تھا، اس پر ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں، ۶۴، ۶۵ برس عمر رہی ہوگی اور صحت اچھی تھی مگر دو ماہ قبل جگر کے کینسر کا عارضہ ہوا اور چل بسے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے نوازے۔

مقالات

علم فتاویٰ اور کتب فتاویٰ

از ڈاکٹر جلال الدین احمد نوری، کراچی۔

(۲)

خصائص الفتاوی

فتاوے کی اہمیت اور خصائص پر بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قانون شریعت کی اہمیت واضح کر دی جائے۔

مسلمانوں کا یہ پُر فخر اور عدیم المثال امتیاز ہے، انگلستان میں بھی قانون سازی کی آزادی کا کوئی وجود نہیں۔ آج کل پارلیمنٹ حکومت کی مرضی کے خلاف کوئی قانون نہیں بنا سکتی، مجالس مقننہ کی کارکردگی پر بر سر کار حکومت یا وزارت ہی کا عمل دخل رہتا ہے، ایک وزارت کے بعد دوسری وزارت آئے تو وہ اپنے پیشرو حکمرانوں کے بنائے قانون کو جتنا چاہے بدل سکتی ہے اور بدل بھی دیتی ہے لیکن اسلام میں قانون سازی ایک غیر سرکاری اور غیر سیاسی عمل ہے، وہ شخص جس نے فقہ کی تعلیم کی تکمیل کی ہے اس میں آزاد ہوتا ہے، اسلامی قانون کا قریب قریب سارا ہی ذخیرہ ان غیر سرکاری، خانہ نشین، خدا ترس ماہرین کتاب و سنت اور علم و اجتہاد کی نجی سرگرمی کا نتیجہ ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ مستبد حکمراں بھی اسلام کی رو سے قانون کو بنانے یا بدلنے کے مجاز نہیں ہوتے، ماہرین فقہ و افتا کی رائے میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، ان کے اختلافی بیانات کو کھنگال کر ان کے آراء کو جمع کرنا بھی علماء ہی کا کام رہا ہے، قانون کا تعلق خواہ مسلمانوں سے ہو یا غیر مسلم رعایا سے اس میں سیاسیات کا کبھی بھی دخل نہیں ہوتا

اور اسلامی قانون میں غیر مسلم رعایا کو مکمل اطمینان اور قانون کے عدم رد و بدل کا یقین رہتا ہے لیکن فرنگی اصول اور کسی غیر اسلامی نظام میں دیکھا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد صریح قانون کو بھی منسوخ کر دیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرے کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہاں قانون عوام کی دسترس میں ہوتا ہے۔ لیکن غیر دینی قوانین میں قانون سے ناواقفیت مجرم کے لیے عذر گناہ نہیں بن سکتی، حالانکہ یہ بات اسی وقت معقول ہوسکتی ہے جبکہ قانونی معلومات کی فراہمی کے لیے ممکنہ سہولتیں فراہم کی گئی ہوں، اسلام میں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک مسلم معاشرے میں ایسی سہولتیں بہم پہونچائی جاتی رہی ہیں، مساجد و مدارس وغیرہ میں علماء و فقہاء یہ کام انجام دیتے رہے ہیں۔

یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ مسلم معاشرے کے افراد خواہ وہ مسلم حکمرانوں کی رعایا ہوں یا غیر مسلم حکمرانوں کی۔ ان کے دلوں کی گہرائی میں قانون شرعی کی بالادستی قائم رہتی ہے اور وہ اکثر و بیشتر قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں، حکومت وقت کے ضابطۂ قانون سے یہ بے نیازی کسی معاشرے میں نہیں دیکھی گئی، دور جدید میں کسی حکومت میں بیک وقت دو ضابطہ ہائے قانون کی عمل داری نہیں مگر مرد مسلم کے لیے شریعت ہر قانون سے بالاتر ہے، فتاوے کا وجود خود ہمارے اس خیال سے تائید کرتا ہے۔ غیر مسلم ہندوستان میں بعض ایسے متدین اور متقی جج صاحبان بھی تھے جو برطانوی قانون کے ساتھ ساتھ شرعی قوانین کا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔

ان کا یہ جرأت مندانہ اقدام کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، قرآن کریم کی یہ آیت مسلمانوں کے لیے آزادی اور غلامی میں مشعل راہ ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى — سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن

يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ — نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف

لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا — جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر

قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ — نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلے سے

(نساء ۴: ۶۵) — اور قبول کریں خوشی سے۔

اگر فتاوے کے تمام سرمایے کا بنظر عمیق مطالعہ کیا جائے تو مختلف حیثیتوں سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ ادبی اور لسانی حیثیت سے فتاوے خاص اہمیت رکھتے ہیں آسان و سلیس اردو میں اہم قانونی مسائل و واقعات کی تشریحات ایک طرف خود زبان اردو کی وسعت اور دوسری طرف زبان پر مجیب و مفتی کی کمال قدرت کی آئینہ دار ہے، علماء میں بکثرت ایسے اصحاب نظر آتے ہیں جنھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ جوابات تحریر فرمائیں۔

مزید برآں چونکہ فتاوے کا موضوع کسی مسئلے کے بارے میں تحقیق ہوتا ہے جس کے لیے مفتی مختلف مطبوعہ و غیر مطبوعہ ماخذ سے استفادہ کرتا ہے، اس لیے ہم اس ذریعے سے ان کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے متعلق بھی معلومات حاصل کر سکتے ہیں جو امتداد زمانہ کی وجہ سے معدوم و مفقود ہو گئے ہیں۔ اس طرح قاموس الکتب کی تدوین اور صحافتی ادب کی تاریخ میں فتووں سے مدد لی جاسکتی ہے۔

فتاوے کو فنی لحاظ سے بھی اردو میں اہم مقام حاصل ہے، مقالہ نگاری (خصوصاً تحقیقی مقالات) کو دور جدید کی پیداوار خیال کیا جاتا ہے، لیکن اگر اس نقطۂ نظر سے فتووں کا جائزہ لیا جائے تو بعض فتوے بلند پایہ علمی و تحقیقی مقالات ہوتے ہیں، فرق صرف تہذیب و تزئین کا ہے اور وہ کوئی بڑا فرق نہیں، تاریخ ادب اردو میں مقالہ نگاری کو علی گڑھ تحریک کا مرہون منت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اس تحریک سے بہت پہلے اور بعد میں

کتب فتاویٰ میں اکثر ایسے فتوے نظر آتے ہیں جن کو اردو کے بہترین مقالات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ طبقہ علماء و فقہاء میں بیشتر حضرات اس تحریک کے مخالف رہے ہیں، اس لیے ان حضرات نے بعد میں بھی جو کچھ لکھا اس کو اس تحریک سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ فتاویٰ مظہری کے بعض جوابات معیاری مقالات میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

لسانی حیثیت سے بھی فتووں کو خاص اہمیت حاصل ہے، ان کے ذریعہ عہد بعہد کے لسانی تغیرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور چونکہ فتووں کا تعلق اسلامی فقہ سے ہے اس لیے اس راستے سے عربی زبان کے جو قانونی الفاظ اردو زبان میں داخل ہوئے ان کا سراغ بھی لگایا جاسکتا ہے، ویسے زبان اردو پر عربی زبان کے اثرات کے سلسلے میں قرآن کریم کی ہمہ گیر تعلیم و تدریس نے اہم کردار ادا کیا ہے، اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔

فتووں کے ذریعہ علمائے اسلام کی ادبی خدمات کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے علماء کی تعلیم و تدریس اور تحریر سے زبان اردو کو بڑا فروغ حاصل ہوا، بیرونی ممالک خصوصاً ایشیائی ممالک میں اردو کی اشاعت میں علمائے کرام نے اہم خدمات انجام دی ہیں، یہ موضوع بھی ایک مبسوط مقالہ کا متقاضی ہے۔

فتاوے تاریخی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتے ہیں، چونکہ تاریخ، اقوام و افراد کے احوال کا مجموعہ ہے اس لیے فتاوے جو کسی قوم کے اجتماعی و انفرادی احوال کی جزئیات پیش کرتے ہیں، تاریخ سازی میں بہت معین ہو سکتے ہیں "کسی ملک اور کسی عہد کے سماجی معاملات، قومی ذہنیت اور تاریخی معلومات کو معلوم کرنے کا ایک بہت ماخذ کتب فتاویٰ ہیں۔ ان میں ایسی ایسی تفصیلات ملتی ہیں جن کا کوئی اشارہ بھی تاریخ کی عام کتابوں میں نہیں

ہوتا، مگر معلومات کے اس ماخذ سے مورخوں نے اب تک کم ہی استفادہ کیا ہے۔

افراد کی طرح اقوام کی بھی ایک روح ہوتی ہے اور اس کے مخصوص اخلاق و خواص ہیں جو درحقیقت اس قوم کے حرکات ترقی و تنزل کے محور ہیں، مشہور فلسفی ڈاکٹر لیبان کے نزدیک صرف نظام اخلاق ہی ہر قسم کے تاریخی انقلابات پیدا کرتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اقوام قدیمہ کے انقلابات و تغیرات کی علت ان کے اخلاق و روحانیت کے انحطاط ہی کو قرار دیا گیا ہے، اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم فتاوے کی روشنی میں ملت مسلمہ کی ترقی و انحطاط کی داستان لکھ سکتے ہیں۔

فتاوے کے ذریعہ ہم کسی علاقے کے مسلمانوں کے رسم و رواج کے متعلق بھی بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ رسم و رواج جو بقول حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تمدن کی جان ہیں۔ گویا فتاوے کی روشنی میں ہم تہذیبی و تمدنی معلومات بھی فراہم کر سکتے ہیں۔

سوانحی مواد میں سوانح نگاری کے ماہرین نے فتاوے کا ذکر نہیں کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک عالم و مفتی کے حالات کی تدوین میں مکاتیب و دیگر تصانیف سے زیادہ فتاوے اہم ہیں، ان میں مجیب و مفتی کی شخصیت اور ذہن کے مختلف گوشوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر "تذکرۂ علماء" مرتب کیا جائے تو فتووں کے ذریعہ ایسے علماء کا پتہ چل سکتا ہے جن کے ناموں سے ہی اب کوئی واقف نہ ہوگا، خصوصاً وہ علماء جنھوں نے فتاوے کے علاوہ کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی۔

نظریاتی اور طبقاتی میدان میں دور متوسط اور دور مابعد میں فتووں کی بڑی گھما گھمی نظر آتی ہے، مختلف افراد یا جماعتوں نے بتقاضائے غیرت مذہبی یا محض ردعمل کے طور پر ایک دوسرے کے خلاف ناقدانہ فتوے لکھوائے ہیں اور بسا اوقات اس قسم کے فتوے

جانبین کی تشہیر کا سامان بھی بن گئے ہیں۔ اس قسم کے فتوؤں سے کسی خاص علاقے کے مسلمانوں کی نظریاتی کشمکش کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اور مختلف مذہبی و سیاسی تحریکوں کے بارے میں جزئیات فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی و غیر اسلامی ممالک اور ملکی سیاست میں خصوصاً مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں میں فتوؤں نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے، تقسیم ہند سے قبل تحریک آزادی کے زمانے میں دیے گئے فتوؤں نے نئی روح پھونک دی تھی، اب بھی اگر کوئی مخلصانہ سیاسی فتویٰ دیا جاتا ہے تو اپنا پورا پورا اثر دکھاتا ہے۔

دورِ جدید میں فتوؤں نے اقتصادی و معاشی اہمیت بھی حاصل کرلی ہے بلکہ سیاسی تحریکوں کے زمانے میں جب کبھی مختلف جماعتوں میں اقتصادی مقاطعہ کی نوبت آئی تو فتوؤں کا سہارا لیا گیا۔ تحریک آزادی ہند کے زمانے میں انگریز حاکموں سے جب ترک موالات کیا گیا تو یہی فتوے روحِ رواں تھے، فتوؤں سے بعض افراد اور جماعتوں نے اقتصادی فائدے بھی حاصل کیے، ایک شخص نے سر سید احمد خاں مرحوم سے تنگ دستی کی شکایت کرتے ہوئے ملازمت کے لیے سفارش کی درخواست کی تو انہوں نے اس کو مخلصانہ مشورہ دیا کہ میرے خلاف کوئی کتابچہ لکھو یا فتویٰ شایع کردو انشاء اللہ تنگ دستی کی شکایت ختم ہوجائے گی۔ ممکن ہے یہ لطیفہ ہو تاہم حقیقت سے یکسر خالی بھی نہیں ہے۔

دورِ حاضر میں جبکہ ہر نیک و بد دولت و ثروت کے اِرد گرد گھومتا نظر آرہا ہے حتیٰ کہ قرآن و حدیث اور وعظ و نصیحت جیسی عظیم چیزوں کو فروغِ تجارت کا آلۂ کار بنایا گیا ہے، فتاوے بھی اقتصادی و تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں چنانچہ بیمہ کمپنیوں کے نمایندے بیمہ کے حق میں بعض مفتیوں کے فتوے پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

آداب المفتی دورِ جدید میں مفتی کی حیثیت اس کے خصائص، اس کی ذمہ داریوں اور فتویٰ نویسی کی ماہیت و حقیقت پر صاحبِ فتاویٰ مظہری[1] نے ایک مختصر نوٹ تحریر فرمایا تھا جو غالباً کسی سوال کا جواب ہے، اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"فتویٰ دینا حقیقتاً مجتہد کا کام ہے اور وہ اس زمانے میں مفقود ہے، اب علماء کا کام صرف مجتہدین کے اقوال کا نقل کر دینا ہے جو حقیقتاً فتویٰ دینا تو نہ ہوا۔ ایسے مفتی ناقل کو چاہیے کہ معتبر کتاب سے اخذ کرکے بغیر اپنی رائے کے دخل کے نقل کرے، لیکن اب یہ دیکھا جارہا ہے کہ عام علماء بغیر اپنی رائے کے دخل کے نقل نہیں کرتے تو ایسے علماء کا ہرگز فتویٰ قابلِ اعتبار نہیں ہوتا، عام لوگوں کو چاہیے کہ ایسے علماء کی طرف کان نہ دھریں۔ محتاط علماء کے فتوے پر عمل کریں۔ ہر عالم فتوے دے سکتا ہے جبکہ قواعدِ فقہ پر عمل کرے اور اپنی رائے کو دخل نہ دے، شہر کا مفتی وہ ہو سکتا ہے جس کو اہلِ شہر بالاتفاق مفتی قرار دے لیں۔ ورنہ جو جس کا معتقد ہو وہ اس کا مفتی ہے۔ مفتی کے لیے ضروری ہے کہ فاسق نہ ہو، فاسق سے فتویٰ پوچھنا جائز نہیں کہ علم فقہ بعت ایک نور ہے جو تقویٰ والوں پر فائز ہوتا ہے، اسے بیدار مغز ہونا چاہیے کہ سوال کو اچھی طرح جانچ کر فتویٰ دے اور واقعہ کی تحقیق کرے، پس جو فتوے دینے کا اہل ہے فتویٰ دے سکتا ہے، بشرطیکہ مسائل کے باب میں اپنے (مقصود) کی رعایت نہ کرے۔"

مولانا مفتی محمد محمود حسن صاحب (تلمیذ رشید مولانا انور شاہ کشمیری) نے مفتی کے آداب سے متعلق بعض باتیں مختلف کتابوں سے جمع فرمائی تھیں، اسی مجموعہ سے چند فنی آداب کا ذکر کیا جاتا ہے:

---

[1] مفتی اعظم مولانا مظہر اللہ الدہلوی المتوفی ۱۹۵۶ء۔

(۱) مسائل مسئولہ کے جوابات میں مفتی سب سے پہلے آیات قرآنیہ سے استدلال کرے گا، پھر احادیث صحیحہ سے پھر اجماع امت اور اس کے بعد قیاس ائمہ مجتہدین سے۔

(۲) جب ائمۂ احناف کا کسی اجتہادی مسئلے میں اختلاف واقع ہو اور ائمہ ترجیح میں سے کسی قول کی ترجیح ثابت نہ ہو تو مفتی کو پہلے امام ابو حنیفہ پھر بقول ابو یوسف پھر بقول امام محمد پھر بقول زفر ابن زیاد فتوے دینا چاہیے۔

(۳) اگر مسئلہ اجتہادیہ نہ ہو تو جب تک اصحاب ترجیح سے کسی کی ترجیح ثابت نہ ہو فتوے مطلقاً بقول ابو حنیفہ دینا چاہیے۔ (شامی)

(۴) اگر اصحاب ترجیح نے قولِ صاحبین کو ترجیح دی ہو تو امام ابو حنیفہ کے قول پر ہرگز فتویٰ نہ دیا جائے۔ (شامی)

(۵) امام ابو یوسف اور امام محمد کے قول پر فتویٰ دینا المذہب الغیر نہیں کیونکہ صاحبین کا قول امام صاحب ہی کا قول ہوتا ہے۔

(۶) جہاں مسئلے میں اختلاف ہو تو اکثر کا اعتبار ہوگا۔

(۷) مفتی اپنی دانست میں جس صورت کو اصلح سمجھے اس پر فتوے دے۔

(۸) مفتی اپنے مذہب کے مطابق فتوے دے گا نہ مستفتی کے مذہب کے مطابق۔

(۹) اگر مسئلے میں مختلف اقوال پائے جائیں تو اگر ان مصحح اقوال میں بعض زیادہ موکد ہوں تو ان پر فتوے دینا چاہیے اور کسی قسم کی ترجیح موجود نہ ہو تو اپنی بصیرت سے جس پر فتوے دے گا، درست ہوگا، ایسی صورت میں جس طریقے میں اصلیت اور سہولت کا پہلو غالب ہو اس کو ترجیح دی جائے۔

(۱۰) اگر ظاہر المذہب کے خلاف عرف کی ترجیح علماء سے ثابت ہو تو ایسی صورت میں

ظاہر المذہب پر فتویٰ نہ دینا چاہیے۔

(۱۱) جواب معلوم ہونے کے باوجود مفتی کو جواب دینے میں عجلت نہ کرنی چاہیے جب تک کہ متعدد مقامات سے جواب کا تیقن حاصل نہ کر لے۔

(۱۲) اس زمانے میں بوجہ غلبۂ جہل مفتی کو مفصل جواب لکھنا چاہیے[۱]

فنی ذمہ داریوں اور آداب کے علاوہ مفتی و فقیہ کے کچھ شخصی و ذاتی اوصاف و خصائص بھی ہوتے ہیں۔

غیر مذہبی عدالتوں کے ججوں کے برعکس شریعت اسلامی کے عالم و مفتی کے لیے لازم ہے کہ وہ شارع علیہ السلام سے کمال عشق و محبت رکھتا ہو، دنیا کے کسی جج کے لیے لازم نہیں کہ وہ مقنن پر بھی ایمان رکھتا ہو، اس کو قانون اور اس کے اطلاقات سے سروکار ہے۔

لیکن ایک مسلم قاضی و مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ شارع علیہ السلام سے والہانہ محبت رکھتا ہو اور اپنے اسلاف کی عظمت سے زیادہ شارع کی عظمت و رفعت کا محافظ و نگہبان ہو، یہ چیز عام مسائل کے حل میں بھی موثر اور بارآور ہے لیکن جن مسائل کا تعلق عقائد و ایمانیات سے ہے وہ اسی وقت فیصل ہو سکتے ہیں جب شارع علیہ السلام سے محبت اور عشق ہو، ورنہ صحیح فیصلے تک پہنچنا مشکل ہے اور ایسے فیصلے جو محض عقل و شعور کی روشنی میں کیے گئے بسا اوقات فتنہ بداماں ثابت ہوئے ہیں ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولین ہے عشق　　　عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

مفتی کے لیے دیانتدار ہونا بھی ضروری ہے، دیانت کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے، اس کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً قولی، عملی، خیالی، ارادی وغیرہ، مفتی کو چاہیے کہ ہر قسم کی خیانت سے اپنا دامنِ امانت بچائے رکھے۔

مفتی کے لیے عصبیت و جانبداری سے پرہیز بھی لازم ہے، اس کا دامنِ صداقت جماعتی رنگ میں رنگے ہونے کے بجائے اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا ہونا چاہیے ومن احسن من اللہ صبغۃ، طبقاتی کشمکش اور ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر، علامہ ابن حزم نے میانہ روی کے اس طریقے کی بڑے موثر پیرایہ میں وضاحت کی ہے۔

یہ میانہ روی اخلاص عمل کا نتیجہ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مخلص ہو، یہی اخلاص مسائل دینیہ کے سمجھنے میں بصیرت و نورانیت عطا کرتا ہے، استاد ابو زہرہ مصری نے امام ابو حنیفہ کے متعلق لکھا ہے:

"امام صاحب طلبِ حق میں مخلص تھے اور یہی وہ صفتِ کمال تھی جس نے ان کے قلبِ بصیرت کو منور کر رکھا تھا، کیونکہ جس شخص کا دل اخلاص سے مالامال ہو وہ خواہشاتِ نفسانی اور خود غرضی سے بلند ہو کر فہم مسائلِ دینیہ کی سعی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے قلب میں اپنی طرف سے نورِ معرفت ڈال دیتا ہے جس سے اس کے مدارکِ فہم روشن ہو جاتے ہیں"[1]

جب کسی مفتی کے اعمال و افکار کی بنیاد اخلاص پر ہوتی ہے تو اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہو سکتا جو روح اخلاص کے منافی ہو، سب سے کٹھن مرحلہ وہ ہوتا ہے جب مفتی اپنے مخالف کے بارے میں قلم اٹھاتا ہے اور اس کے حق میں فیصلے کرتا ہے۔

جب مفتی اپنی حق شناسی اور حق پسندی میں مخلص ہوتا ہے تو اس کے فیصلوں کے بارے میں کسی بھی طرف سے اگر کوئی معقول تنقید ہوتی ہے یا بعد میں وہ اپنی غلطی پر آگاہ ہوتا ہے تو وہ خواہ مخواہ اپنے فیصلوں کی صحت پر اصرار نہیں کرتا بلکہ ان سے بلا پس و پیش رجوع کر لیتا ہے، اس سے مفتی کی وسعتِ قلبی، وسعتِ ذہنی اور حق پسندی کا پتہ چلتا ہے۔

فتویٰ دینا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا، ایسے مشکل اور پیچیدہ سوال بھی بعض وقت پوچھے جاتے ہیں جن سے سر چکرا جاتا ہے، فاضل سے فاضل شخص بھی شش و پنج میں رہتا ہے، پہلے کوئی رائے قائم کرتا ہے پھر رائے بدل بھی دیا کرتا ہے، حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے بصرہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری، (رضی اللہ عنہ) کو آداب قضائت پر جو ہدایت نامہ بھیجا تھا وہ محفوظ ہے اور اس میں انہوں نے یہ صریح حکم دیا ہے کہ کوئی فیصلہ کر لینے کے بعد اگر معلوم ہو کہ اس میں ناانصافی ہوئی ہے تو فیصلہ بدل دو کر حق کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے باطل پر برقرار رہنے سے۔

چنانچہ اسی وجہ سے حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت امام ابو یوسف رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

ہر بات سن کر ضبط تحریر میں نہ لے آیا کرو کیونکہ میری آج ایک رائے ہوتی ہے اور کل اس سے رجوع کر لیتا ہوں، کل ایک رائے قائم کرتا ہوں اور پھر اس سے رجوع کر لیتا ہوں۔[1]

ایک مرتبہ آپ نے یہ بھی فرمایا:

"اگر کوئی شخص اس سے بہتر رائے پیش کرتا ہے تو پھر وہ رائے اولیٰ اور اقرب الی الصواب ہے"[2] ایسے حق پسند علماء بھی تھے کہ اگر ان کی عالمہ و فاضلہ بیویاں کسی مسئلے میں ان کی غلطی نکالتیں تو فوراً رجوع کر لیتے، چنانچہ حنفی فقہ کے ایک ممتاز ترین فرد کاسانی گزرے ہیں جو صاحبِ تصنیف بزرگ تھے، ان کی کتاب بدائع الصنائع سات جلدوں میں نفیس ترین کتابوں میں سے ہے، ان کی ذہانت دیکھی تو ان کے استاذ فقیہ علاء الدین السمرقندی نے اپنی بیٹی فاطمہ ان کو بیاہ دی یہ فاطمہ بڑی فقیہہ تھیں، سوانح نگار لکھتے ہیں کہ بارہا اپنے

[1] محمد ابو زہرہ مصری، امام ابو حنیفہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء، بحوالہ تاریخ بغداد ج ۱۳/ ۲۴۲ [2] تاریخ بغداد ج ۱۳/ ۳۵۲

شوہر" کاسانی" کے فیصلوں کو کاٹ دیتی تھیں کہ اس میں فلاں غلطی ہے اور حق پسند
شوہر اسے تسلیم بھی کر لیتے تھے۔"

مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ صداقت شعار ہو، لفظ صداقت اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے بہت وسیع ہے، اس سے مراد اشیاء، جذبات، تصرفات، عملیات، خیالات، حقوق، واقعات، حادثات اور کیفیات کا بقدر طاقت بشری کے صحیح صحیح معلوم کرنا ہے، صداقت اس وقت تک متحقق نہیں ہو سکتی جب تک اس میں یہ عناصر خمسہ نہ پائے جائیں، صحت جذبۂ صداقت، صحتِ تحقیق، صحت طرز بیان، صحت قوتِ قابلہ اور صحت اصول تنقید۔ ان تمام عناصر میں صحت طرز بیان خاص اہمیت رکھتی ہے، جیسا کہ ایک "قانونِ اخلاق" کا عالم لکھتا ہے:

"صداقت کا اظہار اور تبلیغ ایسے طور پر اور ایسے رنگ میں ہونی چاہیے کہ اس میں کراہیت اور درشتی کا پہلو بہت کم ہو اور سننے والوں پر اس کا اثر ایسے طور سے ہو کہ وہ اس میں ایک حلاوت اور سچی اصلاح کا احساس کریں۔"

بعض وقت صداقت کے بیان میں یا صداقت کے استدلالی رنگ میں فرق آنے کی وجہ سے خود صداقت میں فرق آجاتا ہے اور بعض وقت صداقت کے بیان کرنے میں ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ اس سے صداقت کا اظہار تو فی الواقعہ ہو جاتا ہے لیکن جس طرز سے بیان ہوتا ہے اس میں ایک ایسی کراہیت مترشح ہوتی ہے کہ سننے والے لوگ ایک گھبراہٹ میں پڑ جاتے ہیں اور بجائے ایک مفید اثر کے عموماً برا اثر پڑتا ہے، گو ایسے بیان سے نفس صداقت میں فرق نہیں آتا، مگر ایک ایسے پیرایہ میں اس کا بیان کیا جاتا ہے کہ اس بیانِ صداقت سے ایک اور برائی یا کراہیت پیدا ہو جاتی ہے۔

توحید سے بڑھ کر اور کون سی صداقت ہوگی مگر دعوتِ توحید کے لیے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا:

ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة (النحل ۱۶)

اس نرم خوئی اور میانہ روی کا تعلق فطرت بشریہ سے ہے، اسی لیے فرمایا:

ولو کنت فظا غلیظ القلب لا انفضوا من حولک (توبہ ۹)

گویا اظہار صداقت اگر ترش روئی اور تنگی دل سے کیا جاتا تو صداقت بے اثر ہو کر رہ جاتی اور جو جاں نثار جمع ہو گئے تھے، جمع نہ ہوتے۔

جیسے جیسے اظہار صداقت کے پیرایے بدلتے جاتے ہیں، صداقت کے موثرات میں بھی تبدیلی آتی جاتی ہے، توحید ایک ایسی صداقت ہے جو عہد براہیمی سے برابر پیش کی جاتی رہی ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف انبیاء کے تعلقات کے اثرات ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں، اس اختلاف میں جہاں اقوام کے قابلیت صلاحیت کو دخل ہے وہاں اظہارِ صداقت کے پیرایوں کو بھی دخل ہے۔

شئے کا حسن اسی وقت آشکارا ہوتا ہے، جب اس کو سلیقے سے پیش کیا جاتا ہے، نظامِ کائنات پر نظر تعمق ڈالنے سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے، حق جل مجدہ نے جس کمالِ سلیقہ سے ہر چیز رکھی ہے، اس نے ذرے ذرے میں قیامت کی کشش پیدا کر دی ہے۔

قرآن کریم نے جہاں یہ فرمایا ہے خلق الانسان علمه البیان (رحمٰن: ۴)، تو اس سے حسن اظہار ہی کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ہم جب بیان کی مختلف منزلوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کشش بڑھتی چلی جاتی ہے، بشرطیکہ کہنے والا یا لکھنے والا حسن اظہار کے گر سے واقف ہو۔

قرآن حکیم میں حق جل مجدہ نے عرب کے شعرا اور ادبا سے خطاب کر کے جو یہ

فرمایا ہے کہ اگر تم سے ممکن ہو تو قرآنِ کریم جیسی ایک ہی آیت یا ایک ہی سورت بنا کر لاؤ تو یہاں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اظہار صداقت کا جو اسلوب ہم نے اختیار کیا ہے کائنات ارضی کا کوئی فرد یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اس حسن اظہار تک رسائی حاصل کر سکے، اس کی نظیر پیش کرنا تو بڑی بات ہے، خود قرآنِ عظیم کا جب ترجمہ کیا جاتا ہے تو پیرایۂ بیان کے بدل جانے سے تاثیر میں کتنا بڑا فرق آجاتا ہے، جب کہ صداقت وہی ہے۔

اظہارِ صداقت کا سب سے کٹھن مرحلہ وہ ہوتا ہے جب کسی مختلف فیہ مسئلے کے بارے میں کسی مخالف کے خلاف قلم اٹھایا جائے، حسنِ اظہار کے اصل جوہر یہیں کھلتے ہیں، اکثر دیکھا گیا ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ اور فاضل سے فاضل انسان بھی ایسے مواقع پر اپنے جذبات قابو میں نہیں رکھتا اور اس کی تحریر میں صحت طرز بیان مفقود نظر آتی ہے۔

مفتی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جو کچھ اپنے قلم سے لکھے جب خود ان حالات سے دوچار ہو تو اس پر سختی سے عمل پیرا ہو اور اس کا ہر ہر عمل اس کے قول پر گواہ ہو، درحقیقت یہی دلیل فضیلت ہے۔

مآخذ

۱؎ القرآن الکریم ۲؎ الاحادیث النبویہ (بخاری، مسلم، ابن ماجہ، ابوداؤد، ترمذی و نسائی) ۳؎ المنجد، مطبوعہ بیروت ۱۹۵۱ء ۴؎ المفردات فی غرائب القرآن۔ الاصفہانی، مطبوعہ پشاور ۱۹۶۴ء ۵؎ اسد الغابہ (ترجمہ اردو) محمد عبدالشکور لکھنوی، مطبوعہ لکھنؤ انڈیا ۱۹۵۰ء ۶؎ امام ابوحنیفہ، ابوزہرہ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء ۷؎ الملل والنحل، لابن حزم، حیدرآباد الدکن ۱۹۶۴ء ۸؎ تاریخ الخلفاء، السیوطی، مطبوعہ مصر ۹؎ تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، بغداد ۱۰؎ تاریخ فقہ، ظہور الحسن، حیدرآباد الدکن ۱۹۵۲ء ۱۱؎ تاریخ التشریع الاسلامی، الخضری، دار الاشاعت کراچی ۱۲؎ تاریخ فقہ اسلامی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۴۴ء ۱۳؎ کشف الظنون، حاجی خلیفہ، دار السعادۃ مصر ۱۴؎ فقہائے ہند، محمد اسحٰق بھٹی، لاہور ۱۵؎ فتاوی مظہری، مفتی مظہر اللہ دہلوی، مطبوعہ کراچی ۱۶؎ قاموس الکتب اردو، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء ۱۷؎ نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحی لکھنوی، نور محمد کارخانہ تجارت کراچی ۱۸؎ فتاوی ابن عابدین شامی، مطبوعہ قاہرہ ۱۹؎ مجلہ معارف رضا کراچی ۲۰؎ روزنامہ جنگ کراچی ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء۔

علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ

از جناب محمد الیاس الاعظمی

(۲)

غیر معاندانہ تنقید معاندانہ تنقیدوں کے علاوہ بعض نقادوں نے سیرۃ النبی کی ممتاز حیثیت اور مسلمہ فضیلت کے باوجود اس پر علمی انداز سے تنقیدیں کی ہیں، ذیل میں اس طرح کی چند تنقیدوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

فاضل نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ علامہ شبلی کے بڑے مداح اور ان کے کارناموں کے ثناخواں ہیں، مگر انہوں نے سیرۃ النبی پر بعض اعتراضات وارد کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنے بار بار کے دعویٰ کے باوجود بہت سے مقامات پر شبلی کی رائے معذرت خواہانہ اور مدافعانہ ہے، شبلی نے مورخین یورپ کے اعتراضات سے دب کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے سلسلہ میں ضرورت سے کچھ زیادہ معذرت کا لہجہ اختیار کیا ہے، اسی طرح غلامی اور تعدد ازدواج کے مسئلے کے تجزیے میں بہت کچھ دبے دبے نظر آتے ہیں اور ہر چند کہ وہ پیغمبر کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں بار بار مغربی نقادوں کی اس رائے سے مرعوب ہو کر چلتے ہیں کہ حضورؐ کا ہر قول و فعل عام بشریت کے مطابق تھا، حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام بشر نہ تھے خاص بشر تھے، کتاب کا وہ حصہ بھی قدرے تحقیق طلب ہے جس کا تعلق غزوات کے جغرافیے سے ہے"

شبلی کے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ ان مقامات کا خود مشاہدہ کرتے جہاں جنگیں ہوئیں ہیں[1]

ڈاکٹر سید عبداللہ کے یہ اعتراضات دراصل سیرۃ النبی کے بنیادی مقصدِ تصنیف پر نظر نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے، علامہ شبلی نے سیرۃ النبی کی تصنیف سے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ "میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسبِ موقع حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انہوں نے غلطی اور بددیانتی کی ہے نہایت زور و شور کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے[2]"

اس پردہ دری کو معذرت اور مدافعت سمجھنا درست نہیں، مورخین یورپ نے جس انداز سے کذب بیانی کی ہے اور جھوٹ میں جھوٹ ملایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا کوئی پہلو شاید ہی ان کی تنقیدوں سے محفوظ ہو، اگر ایک سیرۃ نگار مورخ اس کی تردید نہیں کرتا ہے تو اس پر مقصد سے گریز اور مورخانہ ذمہ داری سے صحیح طور پر عہدہ برآ نہ ہونے کا الزام عائد ہوگا، علامہ شبلی نے تو بالکل درست مورخانہ فریضہ انجام دیا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں ادیبوں اور نقادوں کا ایک ایسا طبقہ سامنے آیا جس نے تردید و جواب کو مدافعت اور معذرت کہہ کر اس طرح کی مورخانہ کوششوں کی حیثیت کم کرنے کی کوشش کی، دورِ حاضر کے مشہور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں:

"اسلامی ہندوستانی تاریخ کو مسخ کرنے کا کام جب خطرناک حد تک پہنچ گیا تو اصلاحِ حال کے لیے بعض مسلمان مصنفین نے اپنا قلم اٹھایا، پُرفریب ذہنوں نے ان کے دلائل

[1] فن سیرت نگاری پر ایک نظر، فکر و نظر اسلام آباد د ۱۹۷۶ء، ص ۸۳۱ [2] مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۲۰۱۔

غور کرنے کے بجائے اس سارے لٹریچر کو جوابی اور معذرت آمیز کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کردیا اور مطالعہ سے پہلے ہی ان مصنفین کے اندازِ تحقیق کو مشتبہ بنا دیا[1]"

قدیم مورخین نے عموماً غزوات کے اسباب و علل پر روشنی نہیں ڈالی اور نہ اس سلسلہ میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا، ان کی اس خامی کی وجہ سے مغربی مورخین نے معرکوں کی ابتداء اور جنگ و جدل کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا، چنانچہ علامہ شبلی نے اصولِ تاریخ کی رو سے جب واقعات کے اسباب و علل پر غور کیا خصوصاً غزوات کے سلسلے میں تو یہ حقائق سامنے آئے کہ غزوات کی ابتداء مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ یہ سلسلہ کفار نے شروع کیا، یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ اسباب و علل کی تلاش فلسفۂ تاریخ کی رو سے نہایت ضروری ہے، یہ اصول مغرب ہی کا ایجاد کردہ ہے، علامہ شبلی نے انہیں کے اصول پر عمل پیرا ہوکر انہیں کے اسلوب میں ان کا جواب دیا، اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے معذرت خواہانہ اور مدافعانہ طرزِ عمل اختیار کیا، درحقیقت یہی مورخانہ اور حقیقت پسندانہ اندازِ نگارش علامہ شبلی کا امتیاز ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے اعتراضات تسلیم کرتے ہوئے اگر اسباب و علل کی تلاش نہ کی جائے تو مورخین یورپ کا یہ الزام کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے صحیح ثابت ہوگا۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں "اس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں بھیجی گئیں وہ پہلے سے آمادۂ جنگ اور

[1] شبلی بحیثیت مورخ، ماہنامہ معارف اعظم گڈھ، مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۲۱۰۔

مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے[1]

ڈاکٹر صاحب نے عام بشر اور خاص بشر کی اصطلاحات کے ذریعہ جو اعتراض کیا ہے غالباً اس کی حقیقت سے وہ خود بھی واقف نہیں تھے، اِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ کی تفسیر اور اس کے اسرار و نکات کی جگہ اور ہے، یہاں یہ بے محل اور بے موقع ہی کہی جائے گی۔

جہاں تک مقام غزوات کے جغرافیے کے مشاہدہ کا تعلق ہے بلاشبہ علامہ شبلی نے ان مقامات کا مشاہدہ نہیں کیا تھا لیکن ایک مورخ کے لیے تمام مقامات جنگ کا بچشم خود معائنہ کرنے کا اصول راقم کے خیال میں فن تاریخ میں قطعاً ضروری اور لابدی نہیں سمجھا گیا ہے اسلیے یہ اعتراض بھی غور و فکر سے خالی اور بے وزن ہے۔

ایک اور ناقد ڈاکٹر سید شاہ علی نے سیرۃ النبی میں اقتباس کی کثرت اور تضاد بیانی ڈھونڈھ نکالی ہے، علامہ شبلی کی کسی تصنیف پر اس طرح کا مہمل اعتراض خود ناقد و معترض کے بے بہرہ ہونے کا ثبوت ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف سیرۃ النبی کی جامعیت کے بھی منکر ہیں[2] جبکہ ڈاکٹر سید عبداللہ جامعیت کو سیرۃ النبی کا سب سے بڑا وصف قرار دیتے ہیں[3]، طبقۂ ناقدین کی اس تضاد بیانی کو کیا کہا جائے؛

ڈاکٹر سید شاہ علی کا یہ بھی اعتراض ہے کہ سیرۃ النبی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی کے حالات کا نقدان ہے، تجارتی اسفار، موحدین اور احباب کا ذکر بھی تشنہ ہے حالانکہ اسی سے بیرونی اثرات اور فطری رجحانات کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے[4]۔ یہ اعتراض اگرچہ درست نہیں تاہم اگر کسی درجہ میں اسے درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اسکی

[1] سیرۃ النبی ج ۱ مقدمہ ص ۹۳ [2] اردو میں فن سوانح نگاری ص ۲۰۲ [3] فکر و نظر اسلام آباد مارچ ۱۹۷۶ء ص ۲۵۱، [4] اردو میں فن سوانح نگاری ص ۲۰۴ و ۲۰۵۔

وجہ یہ نہیں ہے کہ علامہ شبلی نے اسے دانستہ نظرانداز کر دیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کے متعلق صحیح روایات کے نقدان کی وجہ سے انھوں نے بے سروپا روایتوں کی تفصیل میں پڑنے کے بجائے اختصار کو ترجیح دیا ہے، شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ "انہیں میں یورپین سیرت نگار اسلام کے ماخذ ڈھونڈھتے ہیں، اس لیے علامہ نے ان معاملات میں خاص احتیاط سے کام لیا ہے[1]"

خلاصہ یہ ہے کہ سیرۃ النبی پر جو اعتراضات کیے گئے ان میں بیشتر جانبدارانہ مطالعہ اور معاندانہ روش کا نتیجہ ہیں، واقفیت اور معقولیت سے ان کا تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

مورخین یورپ کے جوابات

سیرۃ النبی میں علامہ شبلی نے مستشرقین اور مورخین یورپ کی زہر افشانیوں کا خاص طور سے رد و ابطال کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس اور آپؐ کے اخلاق کریمہ پر مورخین یورپ نے متعدد اعتراضات و اتہامات وارد کیے تھے، علامہ شبلی نے ان اعتراضات سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر ان کے جوابات کے لیے انھوں نے سیرۃ النبی کا ایک جدا حصہ خاص کیا تھا، اگرچہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اسے نہ لکھ سکے، تاہم جلد اول میں انھوں نے جابجا ان اعتراضات کی مدلل تردید کر دی ہے، یہاں اس کی ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ زندگی پر بھی مورخین یورپ نے اعتراضات کیے ہیں اور آپؐ کو پیغمبر کے بجائے فاتح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ علامہ شبلی پیغمبر اور فاتح کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" عین اس وقت جب معرکۂ کارزار گرم ہے تیروں کا مینہ برس رہا ہے تمام میدان

[1] یادگار شبلی، ص ۲۴۴۔

لالہ زار بن گیا ہے ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسمِ خزاں میں پتے جھڑتے ہیں دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھتی آرہی ہیں عین اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سر مبارک سجدۂ نیاز میں ہے، معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔[1]

حنین میں دشمن نے دفعتاً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے بارہ ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی پہلو میں نہیں، سامنے دس ہزار قدر انداز تیر برسا رہے ہیں لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پُر جلال آواز آرہی ہے:

انا النبی لا کذب — میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں۔

عین اس وقت جبکہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں اتفاق سے نماز کا وقت آجاتا ہے، دفعتاً نماز کی صفیں قائم ہوجاتی ہیں، سپہ سالار امام نماز ہے، فوجیں صفوف نماز ہیں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں، جوش وخروش، تہور و جاں بازی، غیظ وغضب اب عجز ونیاز، تضرع وزاری اور خشوع وخضوع بن جاتا ہے، صفیں دو۔ دو رکعتیں ادا کرکے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہوجاتے ہیں، یہ دو رکعتیں ادا کرکے پھر اپنی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں اور مشغولینِ جنگ آکر بقیہ نمازیں پوری کر لیتے ہیں، یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں امام (رسول) اول سے آخر تک عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے۔[2]

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱، ص ۳۳۴ [2] ایضاً ص ۳۳۴ - ۳۳۵۔

اسی طرح اور بھی متعدد اعتراضات کا انہوں نے جائزہ لیا ہے مثلاً سر ولیم میور کا یہ اعتراض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان سے نہ تھے[1] یا مارگولیوتھ کی یہ ہرزہ سرائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان مبتذل تھا[2] اور آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب آپؐ کی طرف سے لاپرواہ تھے[3]، یا یہ اعتراض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا[4]، یا عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی[5]، یا یہ افسانہ کہ آپؐ نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کرکے اس کو مکہ پر حملہ کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹے اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کرکے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی مکہ میں آیا تو وہ مکہ پر قابض ہوجائے گا، میرے ہاتھ کیا لگے گا، اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے[6]، یا ڈریپر کی یہ تحقیق انیق کہ بصریٰ کی خانقاہ میں بحیرہ راہب نے آپؐ کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی تھی[7]، اس قسم کے بے بنیاد لغو اور بے سر وپا الزامات بلکہ اتہامات کا علامہ شبلی نے مستند حوالوں اور اصولِ تاریخ کی روشنی میں رد وابطال کیا ہے۔

سیرۃ النبی اس نوع سے لکھی جانے والی پہلی کتاب سیرت ہے اور یہ اس کا خاص وصف وامتیاز ہے۔

سیرۃ النبی اصول تاریخ وسیر کی روشنی میں

علامہ شبلی نے تاریخ اور سیرت نگاری کے جو بلند اور معیاری اصول وضوابط متعین کیے ہیں اور جن کا انہوں نے بار بار ذکر کیا ہے ان پر خود وہ کہاں تک سیرۃ النبی میں عمل پیرا رہے اور ان کا کس قدر پاس ولحاظ رکھا یہاں ہم اسی حیثیت سے سیرۃ النبی کا ایک جائزہ لیتے ہیں اور اس سلسلہ میں نقادوں نے سیرۃ النبی پر جو

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱ حاشیہ ص ۱۰۸ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۱۱۸ [4] ایضاً ص ۱۲۹ [5] ایضاً ص ۱۳۰ [6] ایضاً [7] ایضاً ص ۱۲۰۔

اعتراضات کیے ہیں یا جن کمیوں کی نشاندہی کی ہے ان کی حقیقت وحیثیت کا بھی ایک تجزیہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ سیرت کے متعلق ہم نے علامہ کے نظریۂ تاریخ پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے[1] کہ ان کا پہلا اصول یہ ہے کہ جو واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں ان کے لیے کسی دوسرے ماخذ کی ضرورت نہیں سیرۃ النبی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے ان تمام واقعات میں جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اصل ماخذ قرآن مجید ہی کو بنایا ہے، عقائد اور اوامر و نواہی کا اصل مرجع قرآن مجید ہے، اس لیے ان میں خاص طور سے اس کا اہتمام کیا ہے، غزوۂ بدر، واقعۂ ایلا اور دوسرے بہت سے واقعات میں قرآن مجید کو خاص طور سے پیش نظر رکھا ہے، علامہ شبلی سے پہلے کسی سیرت نگار کے ہاں اس اصول کے اہتمام کی کوشش نظر نہیں آتی، یقیناً یہ علامہ شبلی کی اولیات و امتیازات میں خاص [illegible] رکھتی ہے۔

۲۔ علامہ شبلی نے واقعات سیرت کے متعلق قرآن مجید کے بعد احادیث صحیحہ کو اصل ماخذ قرار دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ تاریخ اور سیر و مغازی کے مقابلہ میں احادیث کا سرمایہ زیادہ مستند ہے اس لیے انہوں نے تالیف سیرت میں تاریخ و سیر کی روایات کے مقابلہ میں احادیث صحیحہ کو فوقیت دی اور سیرۃ النبی میں اپنے اس اصول کا خاص اہتمام کیا، ان سے پہلے اس طرح کی کوشش پروفیسر مارگولیوتھ نے اپنی کتاب محمدؐ میں کی تھی مگر علامہ شبلی پہلے مورخ ہیں جنھوں نے اس اصول و ضابطہ کو واقعی اہمیت وحیثیت دی اور اسے سیرت کا بنیادی ماخذ قرار دیا کیونکہ وہ اپنے وسیع مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ "اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں،[2] اور جو واقعات

[1] یہ مضمون ان شاء اللہ آیندہ شائع ہوگا۔ [2] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۶۵۔

بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں[1] خود علامہ شبلی کو اس کا احساس تھا، چنانچہ ایک جگہ صاف لکھا کہ "ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مہیا کیے جو اہل سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے"[2] مثلاً واقعہ غرانیق میں ارباب تاریخ و سیر نے جو روایات نقل کی ہیں انہیں سرے سے اسی بنا پر مسترد کر دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی وغیرہ نے ان روایات کو باطل اور موضوع قرار دیا ہے۔

اسی طرح حضرت زینبؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے بارے میں متعدد بے سر و پا روایتیں ارباب سیر نے نقل کی ہیں، علامہ شبلی نے ان باطل روایات کو مسترد کر کے ان کے مقابلہ میں صحیح احادیث و روایات کو پیش کیا ہے۔

بعض لوگوں نے علامہ شبلی پر ان کے اس اصول کی خلاف ورزی کا الزام لگایا ہے اور اعداد و شمار کی روشنی میں لکھا ہے کہ "اس کتاب کے مواد و مشتملات کی تحقیق و تفتیش کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ سیرۃ النبی میں غیر مستند یا کم مستند روایات کا تناسب کم از کم پچاس یا ساٹھ فیصد ہے"[3] مگر چونکہ ان نام نہاد محققین نے علامہ شبلی کی خردہ گیری کے شوق میں ان کے اصول تاریخ و سیر کو پیش نظر نہیں رکھا اس لیے ان کو اس سعی لاحاصل پر ہی قناعت کرنی پڑی، حقیقتاً علامہ شبلی نے پورے طور پر غیر مستند روایات سے احتراز کیا ہے۔

۳۔ ماخذ سیرت سے متعلق علامہ شبلی نے یہ اصول بھی پیش کیا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے بعد تاریخ و سیر کا درجہ ہے، چنانچہ انہوں نے روزمرہ اور عام واقعات میں تاریخ

[1] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۶۵ [2] ایضاً [3] ترجمان الاسلام دارالسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء ص ۱۳۔

وسیر کی روایتیں نقل کی ہیں، ان میں بھی جو اہم واقعات ہیں ان میں اولاً احادیث صحیح کی تلاش کی ہے، نہ ملنے پر تاریخ وسیر کی روایتیں نقل کی ہیں، لیکن اس میں بھی ان کا معیار کہیں فروتر نہیں ہے۔

۴۔ جیسا کہ نظریۂ تاریخ کے ضمن میں لکھا جاچکا ہے علامہ شبلی نے مورخ کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ جس عہد کی تاریخ لکھے اس عہد کے تمام سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حالات قلم بند کرے، چنانچہ علامہ شبلی نے اس اصول کے مدنظر عہد رسالت کے تمام سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حالات و واقعات کا استقصا کیا ہے اور خاص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی حالات و سوانح اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ کی تمام تفصیلات اس طرح تحریر کی ہیں کہ عہدِ نبویؐ کا معاشرہ بلکہ ہر پہلو اور ہر گوشہ واضح طور پر سامنے آگیا ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"شبلیؒ نے آپؐ کی شخصیت کی خارجی اور بشری جزئیات اتنی مفصل پیش کی ہیں کہ سیرۃ النبی کو اردو میں سوانحی ادب کی مکمل اور مفصل ترین کتاب کہا جاسکتا ہے آپؐ کی خلوت اور جلوت کے باریک اور چھوٹے چھوٹے واقعات اور جزئیات، آپؐ کی عادات و شمائل کے لطیف سے لطیف پہلو ان سب باتوں سمیت جن کا اظہار عموماً نہیں کیا جاتا، سیرۃ النبیؐ کے اوراق میں جمع ہوگئے ہیں"[1]

تاریخ کے اس بنیادی اصول سے لکھی جانے والی اردو میں سیرت کی یہ پہلی کتاب قرار دی جاسکتی ہے، کیونکہ اس سے پہلے عموماً تاریخ کی کتابوں میں کسی ایک ہی پہلو پر توجہ دی جاتی تھی، سیرۃ النبی سے پہلے کی اردو تصانیف سیرت کے بارے میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

۱؎ سرسید اور ان کے نامور رفقاء، ص ۱۵۱۔

"سیرت کی تالیف سے پہلے اردو میں سیرت نبویؐ پر جس قدر کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر مغازی و اخلاق و شمائلِ نبویؐ پر مشتمل ہیں اور ان میں روایات کی صحت اور تحقیق و تنقید کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا اور وہ ہر قسم کی رطب و یابس روایات کا مجموعہ ہیں"[1]

۵۔ علامہ شبلی کے نزدیک مورخ کا ایک ضروری فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ جو کچھ لکھے صحیح لکھے اور واقعات کی صحت کے لیے ہر ممکن تحقیق و تنقید سے کام لے چنانچہ خود علامہ شبلی از اول تا آخر اس اصول پر قائم نظر آتے ہیں، انہوں نے اپنے پیشرو اسلامی مورخین کی بہ نسبت زیادہ چھان بین سے کام لیا ہے اور کوئی بھی واقعہ یا روایت بغیر صحت و صداقت کے نقل نہیں کیا ہے، حتیٰ کہ جس واقعہ یا روایت میں کسی قسم کی کوئی کمی یا خامی نظر آئی اسے نظر انداز کردیا، بعض مقامات پر اس کے اسباب بھی لکھ دیے ہیں، اس سلسلہ میں چند اہل قلم نے اعتراضات بھی کیے ہیں، مگر وہ اعتراضات اصلاً فنِ حدیث اور تاریخ و سیر کے بنیادی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

۶۔ واقعات کی صحت کی تعیین کا ایک اسلامی اصول روایت ہے، علامہ شبلیؒ نے خاص طور پر مورخ کے لیے اس اصول کا بروئے کار لانا ضروری قرار دیا ہے اور روایتوں کو بلا بحث و تمحیص نقل کرنے کو رواۃ پرستی سے تعبیر کیا ہے[2] اور خود سیرۃ النبی میں روایت اور اس کے اصول و فروع اور جزئیات سے کام لے کر ہر ممکن کوشش کی ہے کہ واقعہ میں صحت کی تعیین ہوجائے، قدیم ارباب سیر و تاریخ کے ہاں اس کا التزام نظر آتا ہے، مگر ان سے غلطی یہ ہوئی کہ عموماً ان حضرات نے یہ روایتیں حدیث کی کتابوں میں ان موقعوں پر تلاش کیں جہاں انہیں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے درج ہونا چاہیے اور جب وہ وہاں نہ ملیں

۱؎ معارف سلیمان نمبر ص ۷۰، ۲؎ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۲۱۔

تو کم درجہ کی روایتیں نقل کر دیں جس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، خاص طور سے مورخین یورپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات کیے وہ انہیں کم درجہ روایتوں کی وجہ سے پیدا ہوئے جنھیں مغربی مورخین کی ملمع سازی نے مزید رنگ دیدیا، مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں:

"یورپ کے اکثر مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معیار اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں ان کا کل سرسبد یہی روایتیں ہیں"[1]

۔ علامہ شبلی نے مورخ کے لیے صحت واقعہ میں روایت کے پہلو بہ پہلو درایت سے کام لینا بھی ضروری قرار دیا ہے بلکہ اپنے تمام اصول تاریخ نویسی کے مقابلہ میں سب سے زیادہ زور اسی پر دیا ہے، سیرۃ النبی میں اس اصول کی جلوہ گری پوری طرح نظر آتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مختلف واقعات میں ارباب تاریخ و سیر سے ان کے اختلاف کی وجہ اکثر یہی اصول درایت ہی ہے، مثلاً غزوۂ خیبر کے ذکر میں کنانہ بن ابی الحقیق کے بارے میں لکھتے ہیں:

"خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے، یعنی یہ کہ اول آپؐ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں، لیکن جب کنانہ بن ابی الحقیق نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپؐ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں، حضرت زبیرؓ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے، یہانتک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی"

سادہ طور پر روایت نقل کرنے کے بعد ان کا درایتی معیار ملاحظہ ہو:

"کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لیے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ

[1] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۹۱۔

بھاڑ دی جائے رحمت للعالمینؐ کی شان اس سے بہت ارفع ہے، وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا، کیا چند سکوں کے لیے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے"[1]

یہ روایت متصل اور صحیح ہونے کے باوجود چونکہ درایت کے معیار سے ناقابل فہم ہے اس لیے علامہ شبلی نے اسے نظر انداز کر دیا۔

اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہونے کی تفصیل صحیح بخاری کی دو روایتوں میں مذکور ہے، پہلی روایت باب بدء الوحی میں جس میں فرشتۂ غیب کا نظر آنا، اس کو دیکھ کر آپؐ کا خوفزدہ ہو جانا، حضرت خدیجہؓ کا آپؐ کو تسلی دینا اور ورقہ بن نوفل کے پاس لے جانا مذکور ہے، لیکن دوسری روایت جو باب التعبیر میں ہے، ان تفصیلات کے علاوہ اس میں مندرجہ ذیل اضافہ ہے:

"چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں دفعتاً حضرت جبرئیلؑ نظر آتے تھے اور کہتے تھے اے محمدؐ تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو، لیکن جب پھر وحی کچھ دن کے لیے رک جاتی تھی تو پھر آپؐ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبرئیلؑ نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپؐ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں"

دوسری روایت کے اس اضافہ پر علامہ شبلی درایت کی رو سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جبکہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبوت سے پہلے سفر شام میں بمقام (بصریٰ)

[1] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۴۴-۲۴۵۔

جس درخت کے نیچے آپؐ بیٹھے تھے اس کی تمام شاخیں آپؐ پر جھک آئیں جس سے بحیرا راہب نے آپؐ کے نبی ہونے کا یقین کیا، جبکہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا جبکہ صحاح ستہ میں موجود ہے کہ نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپؐ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلائش نکال کر پھینک دی تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپؐ اس قدر خوفزدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا اور آپؐ اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے اور بار بار حضرت جبرئیلؑ کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی تھی، کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا، حضرت موسیٰؑ نے درخت سے آواز سنی کہ میں خدا ہوں تو کیا ان کو کوئی شبہ پیدا ہوا"[1]

۸۔ علامہ شبلی نے واقعات کے اسباب وعلل کی تلاش اور اس سے صحیح نتائج مستنبط کرنے کو ضروری قرار دیا ہے اور انہوں نے خود واقعات میں سبب اور مسبب کی تلاش کی ہے، اور استنباط نتائج میں روایت و درایت، عقلِ سلیم اور دلائل و براہین سے کام لیا ہے، علامہ شبلی کے ایک نئے ناقد نے ان کی اس خصوصیت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

" سب سے اہم اور قابلِ ذکر چیز واقعات سیرت کے بیان میں مورخانہ اسباب وعلل کی تلاش ہے، مولانا نے اس طرف خاص توجہ دی ہے اور سیرۃ النبی میں جابجا مستقل عنوانات قائم کر کے بعض اہم واقعات اور ان کے اسباب پر بہت عمدہ بحثیں کی ہیں، جن کی مثالیں عام کتب سیرت میں نہیں ملتیں"[2]

۱؎ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۳۷-۱۳۸ ۲؎ ترجمان الاسلام وارانسی جنوری تا مارچ ۱۹۹۴ء ص ۱۷۔

مثلاً قریش کی مخالفت، قریش کے تحمل، اسلام کی اشاعت، تحویل قبلہ، مسلمانوں کی فتح، غزوات اور کثرت سرایا کے اسباب وعلل وغیرہ۔

۹۔ سبب اور مسبب کی تلاش کے بعد استنباط نتائج میں مورخ کو عموماً قیاس واجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے، علامہ شبلی کا خیال ہے کہ اصل واقعہ اور مستنبط نتیجہ کو الگ الگ بیان کرنا چاہیے، چنانچہ خود انہوں نے سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد نتائج قلم بند کیے ہیں، خصوصاً غزوات کی بحث میں یہ اصول صاف کارفرما ہے۔

۱۰۔ علامہ شبلی نے مورخ کے لیے ایک نہایت سخت اصول مقرر کیا ہے کہ وہ جس واقعہ کو لکھے مورخ اس کے فن سے بخوبی واقف ہو ورنہ اس کی نظر واقعہ پر سطحی پڑے گی اور واقعہ کی روح تک نہ پہنچ سکے گا، ظاہر ہے یہ ایک مشکل امر ہے مگر علامہ شبلی اپنے اس مشکل اصول پر بھی کاربند نظر آتے ہیں، وہ ایک جامع العلوم والکمالات مصنف تھے، اسی وجہ سے ہر واقعہ کی تہ اور اس کی اصل روح تک ان کی دوررس نگاہ پہنچ جاتی ہے۔

۱۱۔ علامہ شبلی نے غیر جانبداری پر بھی بڑا زور دیا ہے اور رینکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مورخ کے طرزِ نگارش سے اس کے قوم ومذہب ذاتی اعتقاد اور اس کی خوشی وناخوشی کا اظہار نہیں ہونا چاہیے، اس اصول پر بھی سیرۃ النبی پوری اترتی ہے، باوجودیکہ اس سے علامہ شبلی کے عشقِ رسولؐ کا واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے مگر ایسا کہیں نہیں ہوا کہ حق وصداقت کو بالائے طاق رکھ کر محض اخلاص وعقیدت کا نذرانہ پیش کیا گیا ہو، ڈاکٹر سید شاہ علی کا یہ لکھنا کہ "شبلی اپنے مذہبی جذبہ پر پوری طرح قابو نہیں پا سکے اور عشقِ رسولؐ کے زیر اثر مذہبی اور اخلاقی سرگرمیوں کا شکار ہو گئے"[1] اور یہ کہ سیرۃ النبی میں کہیں کہیں محبت وعقیدت مدلل

۱؎ اردو میں فن سوانح نگاری ص ۲۰۰۔

مداحی کی شکل اختیار کر گئی ہے[1] بجا نہیں ہے کیونکہ علامہ شبلی نے مذہب اسلام کے مصنفات کے ساتھ توراۃ و انجیل اور صحف سماوی سے استدلال کیے ہیں اور ماقبل بعثت عرب کے جو حالات لکھے ہیں وہ اس کی تردید کے لیے کافی ہیں، ڈاکٹر انور محمود کا نقطۂ نظر بھی لائق توجہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

"جو مصنف کسی ایسے شخص کی سوانح عمری لکھ رہا ہو جو نہ صرف اس کا اپنا محبوب نظر ہو بلکہ کروڑوں انسانوں کی عقیدت کا مرکز ہو، اس کے حالات رقم کرتے وقت جوش وجذبہ کا مظاہرہ ہونا کوئی خلاف حقیقت بات نہیں ہے، پھر صاحب سوانح مذہبی شخصیت ہو تو اس کی سوانح سے مذہب کیسے خارج کیا جاسکے گا، دیکھنا صرف یہ ہے کہ عقیدت کے غلو میں کہیں سوانح نگار مذہبی اور اخلاقی جذبے سے مغلوب تو نہیں ہو گیا، سیرۃ النبی پڑھنے والا ہر شخص گواہی دے گا کہ ایسا نہیں ہوا"[2]

۱۲- علامہ شبلی نے مورخ کو اس بات سے بھی آگاہ کیا ہے کہ اس کا منصب سادہ واقعہ نگاری ہے انشا پردازی نہیں کیونکہ تاریخ اور انشا پردازی کی حدیں جدا جدا ہیں، اس لیے مورخ کو تاریخ میں انشا پردازی کا جوہر نہیں دکھلانا چاہیے، چنانچہ خود انہوں نے سیرۃ النبی میں سادہ واقعہ نگاری سے کام لیا ہے اور کہیں بھی مورخ شبلی پر انشا پرداز شبلی کا غلبہ نہیں ہوا ہے، یہاں اس شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ سیرۃ النبی میں واضح طور پر جو ادبی رعنائی و گلکاری کا احساس ہوتا ہے وہ انشا پردازی نہیں بلکہ علامہ شبلی کے ادبی اسلوب کا خاصہ اور جوہر ہے جس سے وہ خود بے نیاز نہیں ہوسکتے تھے اور نہ اس کی وجہ سے وہ کہیں تاریخی اصولوں سے منحرف ہوئے۔ غرض یہ کہ سیرۃ النبی میں ان کی فطری انشا پردازی ہے، اس کا تعلق تصنع اور بناوٹ سے

[1] اردو میں فن سوانح نگاری، ص ۲۰۵ [2] اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۵۸۵۔

نہیں ہے اور سیرۃ النبی کا ہر صفحہ اس کا شاہد ہے، اس کے سرنامہ اور ظہور قدسی پر تو الہام کا شبہ ہوتا ہے، یہاں چند دوسرے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ علامہ شبلی کی فطری انشا پردازی اور تاریخی دیانتداری کا اندازہ ہوسکے۔

۱- خطبۂ فتح مکہ کے بعد کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

"خطبے کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکر قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آآکر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا تم کو کچھ معلوم ہے؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے شقی تھے بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے پکار اٹھے کہ "تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے" ارشاد ہوا تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو"[1]

۲- ارباب سیر و مغازی کی داستان سے مورخین یورپ کی خاص دلچسپی کا ذکر کرتے

[1] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۶۳۔

ہوئے لکھتے ہیں :

"کیا عجب بات ہے کہ ارباب سیر و مغازی کی داستان جس قدر درازنفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے کیونکہ اسلام کے جور و ستم کا جو مرقع آراستہ کرتا ہے اس کے نقش و نگار کے لیے چند قطرے نہیں چشمہائے خون درکار ہیں"۔[1]

۱۲۔ تاریخ نگاری میں سند اور حوالہ کے بارے میں علامہ شبلی کا نقطۂ نظر پیش کیا جاچکا ہے، یہاں یہ واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے سند اور حوالہ، مراجع و مصادر کا سیرۃ النبی میں خاص اہتمام کیا ہے اور کوئی واقعہ بغیر سند اور حوالہ کے نہیں لکھا ہے، قرآن پاک کے علاوہ حدیث، تفسیر، اصول حدیث، طبقات و تراجم تاریخ اور سیر و مغازی کی سیکڑوں کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں، دراصل علامہ شبلی اردو کے پہلے مورخ ہیں، جنھوں نے حوالہ اور مآخذ و مراجع کی نشان دہی کی ابتدا کی، ان سے پہلے اس اصول کا اس قدر اہتمام کسی اور مورخ نے نہیں کیا، اردو میں علامہ شبلی اس اصول کے موجد تصور کیے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی میں اپنے تاریخی اصولوں کا ہر ممکن پاس و لحاظ رکھا ہے اور اسی وجہ سے وہ جملہ سیرت نگاروں میں سب سے زیادہ قدآور اور بلند پایہ تسلیم کیے گئے ہیں اور اختر وقار عظیم نے اسی بنا پر یہ لکھا ہے کہ "آج تک سیرۃ النبیؐ سے زیادہ محققانہ، عمدہ اور جامع المعلومات کتاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں لکھی گئی"۔[2]

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۰۷۔ [2] شبلی بحیثیت مورخ ص ۱۲۳۔

ابوعبیدہ اور ان کی مجاز القرآن

از ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی۔ علی گڑھ

قرآن مجید کی تفسیر و تاویل اور فہم و معرفت میں صحابۂ کرام میں دو طرح کی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک میں حضرات ابوبکر، عمر اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم شامل ہیں اور دوسری میں حضرت عبداللہ بن عباس ہیں۔ پہلا گروہ ضیق میں پڑنے اور تکلف کا قائل نہیں تھا، اس لیے وہ قرآن پاک کی تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ہی کیا کرتا تھا، جب کہ دوسرا گروہ اشعار عرب کے ذریعہ قرآن پاک کو سمجھتا تھا، یہ گروہ تاویلات کا سہارا لیتا تھا جس کی بنیاد یہ تھی کہ قرآن پاک عربی میں نازل ہوا ہے جیسا کہ فرمایا گیا "بلسان عربی مبین"[1] (یہ کتاب) صاف صاف عربی زبان میں ہے اور دوسری جگہ فرمایا گیا "وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ"[2] (ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے) جو رسول بھیجا اس نے اپنی قوم کی زبان میں پیغام دیا، دوسرے گروہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام قرآنی الفاظ کی وضاحت نہیں چاہی کیونکہ وہ زبان و ادب کی نزاکتوں سے واقف تھے۔ ابن خلدون اس خیال کی تائید کرتے نظر آتے ہیں اور ابن قتیبہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ اہل عرب آپس میں غریب اور متشابہات سے واقفیت کے معاملے میں یکساں صلاحیت کے حامل نہیں تھے[3]۔

اسی بنا پر علمائے لغت و ادب نے قرآن پاک کے غرائب کی شرح و تفسیر لکھی ہے چنانچہ دوسری صدی ہجری میں جب تفسیریں مرتب کی جانے لگیں تو علمائے لغت و نحو نے بھی قرآن پاک کو

موضوعِ بحث بنایا اور ان کی کوششیں معانی القرآن کے موضوع پر مرتکز ہوئیں۔ ابوالحسن الکسائی
سعید بن سعد اور الاخفش کے علاوہ ابوجعفر رواسی، نضر بن شمیل، فراء، زجاج، ابوعلی الفارسی
ابوجعفر النحاس اور قطرب نے معانی القرآن کے موضوع پر کتابیں تالیف کیں، اسی دور میں کچھ
دوسری تالیفات بھی منظرِ عام پر آئیں جو محض قرآن کے غرائب کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہیں، ان
تمام کتابوں میں مؤرج السدوسی، ابن قتیبہ، محمد بن سلام الجمحی اور ابی عبداللہ بن عرفہ کی کتابیں نمایاں
حیثیت کی حامل ہیں جو غرائب القرآن کے موضوع پر قدر و قیمت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔
بعض دوسرے اصحاب نے قرآنی الفاظ کے معین گوشوں کو بے نقاب کیا ہے، جیسے اصمعی، فراء
اور ابوزید کی "لغات القرآن"۔ علماء کا ایک طبقہ وہ ہے جس نے اپنی توجہات کا ہدف اسلوبِ
قرآن، معانی، نظم اور الفاظ و معانی کے باہمی ربط کو بنایا۔

قرآنی ادبیات کو جن علمائے لغت نے اپنا موضوع بنایا ہے ان میں ابوعبیدہ اولیت کے
حامل ہیں۔ انہوں نے مجاز القرآن تالیف کر کے ایک نمایاں درجہ حاصل کیا ہے۔ بصرہ کو
جس طرح نحو میں مرجعیت حاصل ہے بعینہٖ اسی طرح لغت میں بھی تقدم کا شرف حاصل ہے،
چنانچہ زبان و بیان میں جن لوگوں کو سند کا درجہ حاصل ہوا ان میں سے اکثر کا تعلق بصرہ
ہی کی زرخیز زمین سے ہے۔ ان میں اصمعی، ابوزید اور ابوعبیدہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔
ان کے نام آسمانِ لغت و ادب پر ہمیشہ درخشاں رہیں گے۔

ابوعبیدہ نے الانباری کے بقول سنہ ۱۱۰ھ کی اس رات میں آنکھیں کھولیں جب کہ
حسن بصریؒ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۴] یہ خوارج سے قریب تر تھے اور ان ہی کی رائے کو
ترجیح دیتے تھے۔[۵] ابوعبیدہ کی شخصیت پر انگشت نمائی بھی کی گئی ہے کیونکہ یہ لوگوں کو سب و شتم
کرتے اور انہیں برا بھلا کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔[۶] انہوں نے بالخصوص آلِ مہلب کو نشانہ

بنایا۔

ابوعبیدہ اپنے معاصرین اصمعی اور ابوزید کی طرح لغت، نحو اور نوادر ہی پر نہیں بلکہ علوم
و فنون کے بیشتر شعبوں پر عبور رکھتے تھے۔ اخبارِ عرب اور ایامِ عرب میں ان کا کوئی مثیل نہیں تھا۔[۷]
انہوں نے بصرہ اسکول کے سرکردہ علمائے لسانیات ابوعمرو بن العلاء اور یونس بن حبیب کے
سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اپنے زمانہ کے مروجہ طریقے کو پیشِ نظر رکھا اور منتشر اور زبانی
مواد کی مدد سے عرب اور صدرِ اسلام کی ثقافت پر درجنوں رسالے تالیف کیے۔[۸]

ابوعبیدہ کی تصنیفات بطرس بستانی کے بقول ان کی تالیفات کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔[۹]
یہ تصنیفات قرآن، لغت، امثال، اشعارِ عرب اور تراجم پر مشتمل ہیں۔ لیکن ان کی چند کتابیں ہی
زمانے کے دستبرد سے محفوظ رہ گئی ہیں۔ مثلاً نقائض جریر و الفرزدق اور طبقات الشعراء
اور مجاز القرآن وغیرہ۔ بروکلمان نے ابوعبیدہ کی کتابوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے، جن میں
مندرجہ ذیل کتابیں بڑی شہرت کی حامل ہیں۔

(۱) طبقات الشعراء (۲) المحاضرات والمحاورات (۳) کتاب الخیل (۴) کتاب تفسیر
غریب القرآن (۵) تسمیۃ ازواج النبیؐ (۶) کتاب المثالب (۷) مقاتل فرسان العرب (۸)
اخبار العقعق والبررۃ (۹) شرح نقائض جریر والفرزدق (۱۰) کتاب الضیفان (۱۱) کتاب
التاج فی الانساب (۱۲) کتاب المصنف (۱۳) کتاب مجاز القرآن (۱۴) کتاب الدیباجۃ
(۱۵) کتاب الفرق (۱۶) کتاب ایام العرب[۱۰]

ابوعبیدہ کو تفسیر، حدیث، فقہ اور اخبار وغیرہ میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ اگر تفسیر، حدیث،
اور غرائب میں ان کی کاوشیں انہیں ایک منفرد لغوی ثابت کرتی ہیں تو تاریخِ عرب اور ان کے
احوال و کوائف سے متعلق ان کی تلاش و جستجو ان کے ایک مورخ ہونے پر شاہد ہیں، اخبار و

اقوال کے وہ محض راوی و ناقل ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی تہوں سے لعل و گہر بھی نکالتے ہیں۔ شعر و شاعری کی اصل فنی خوبیوں کا ادراک کرتے ہیں۔ شعر کے صوتی آہنگ سے شناسائی حاصل کرتے ہیں اور شاعر کے معانی و مفاہیم کو بے نقاب کرتے ہیں۔

ابوعبیدہ کے خارجی ہونے پر اتفاق ہے گو وہ اس میں اخفا سے کام لیتے تھے بعض لوگوں نے انہیں صفری،[11] بعض نے اباضیہ[12] اور بعض نے قدریہ[13] بتایا ہے مگر حقیقتاً ان کا کسی خاص فرقے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی وہ فرقے ان کو محبوب رکھتے تھے، البتہ وہ فرقۂ اباضیہ کے اشعار اکثر و بیشتر پڑھا کرتے تھے اور ان کے اخبار و کوائف اور مفاخر پر رطب اللسان رہتے تھے، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے فرقہ اباضیہ کو اپنی خاص توجہات کا مرکز بنایا۔ جاحظ کا بیان ہے کہ روئے زمین پر علوم و فنون میں ابوعبیدہ کا کوئی مماثل نہیں تھا۔[14] صاحب عقد الفرید کی رائے میں ابوعبیدہ نے ایام عرب کے وہ اخبار و احوال نقل کیے ہیں جنھیں مورخین اب تک نقل کرتے چلے آرہے ہیں۔[15]

ابوالطیب عبدالواحد لکھتے ہیں کہ اہلِ فن کے نزدیک ابوعبیدہ نحو کا تیسرا بڑا عالم تھا۔[16] عبدالرحمن الانباری کا بیان ہے کہ ابونواس کو ایک مرتبہ خبر ملی کہ خلیفہ نے اصمعی اور ابوعبیدہ کو مسائلِ فن پر گفتگو کے لیے بلایا ہے تو یہ بھی حاضر ہوا اور کہا کہ ابوعبیدہ عالم ہے۔ وہ اپنی کتابوں سے چپٹ کر اسے پڑھتا رہتا ہے اور اصمعی پنجرے میں بلبل کی طرح ہے جس کا نغمہ کانوں میں رس گھولتا ہے۔[17]

جرجی زیدان کہتے ہیں کہ ابوعبیدہ کے مرتبہ و عظمت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ابوعبید القاسم بن سلام، ابوعثمان المازنی اور ابوحاتم السجستانی جیسے ماہرین نے ان کی حاشیہ نشینی اختیار کی اور ان کے افادات سے اپنے علمی کشکول کو پر کیا۔[18]

یہ عجیب بات ہے کہ ایام عرب، اخبارِ عرب اور لغت پر عبور رکھنے کے باوجود ابوعبیدہ اشعار صحیح نہیں پڑھتے تھے اور قرآن مجید بھی جب پڑھتے تو اغلاط سے محفوظ نہیں رہتے تھے۔[19] وہ خودستائی کے بھی عادی تھے اور جیسا کہ پہلے گزرا دوسروں کی تنقیص و مذمت بھی کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ابوعبیدہ کی قرآنی خدمات نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ مجاز القرآن انکی بڑی اہم تصنیف ہے، اس میں مجازات کی تشریح و توضیح زبان و ادب کی چاشنی کے ساتھ موجود ہے۔

مجاز القرآن کا نام "معانی القرآن" "مجاز القرآن" اور "غریب القرآن"، تین کتابیں ابوعبیدہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔[20] لیکن مجاز القرآن کے علاوہ قرآن پر ان کی کسی دوسری تالیف کا سراغ نہیں ملتا۔ مجاز القرآن کے مقدمے میں سزگین کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس کتاب میں قرآن کے معانی، مجاز اور غرائب کو واضح کیا گیا ہے اس لحاظ سے یہ کتاب تینوں ناموں سے جانی جاتی ہے۔ اس کی تائید میں وہ دو جید عالم کی آرا بھی پیش کرتے ہیں۔

طبقات النحویین میں ہے

سالت اباحاتم عن غریب القرآن لابی عبیدۃ الذی یقال لہ المجاز[21]	میں نے ابوحاتم سے ابوعبیدہ کی کتاب غریب القرآن کے بارے میں پوچھا جسے کتاب المجاز کہا جاتا ہے۔

ابن خیر اشبیلی کی فہرست میں ہے:

واول کتاب جمع فی غریب القرآن ومعانیہ کتاب ابی عبیدۃ معمر بن المثنیٰ وھو کتاب المجاز[22]	سب سے پہلی کتاب جسے غرائب قرآن اور اس کے معانی کے باب میں جمع و تالیف کا جامہ پہنایا گیا وہ ابوعبیدہ

معمر بن المثنیٰ کی "کتاب المجاز" ہے۔

مجاز القرآن کے نسخوں میں بھی نام کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ نسخہ اسمٰعیل صائب نجد میں "کتاب مجاز القرآن" ہے اور اس کی دوسری جلد میں " النصف الاخیر من کتاب غریب القرآن دیا ہے، مراد ملا کے نسخہ میں "کتاب المجاز التفسیر غریب القرآن"[۲۳] بہرحال یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ قرآن سے متعلق "مجاز القرآن" ہی ابو عبیدہ کی واحد تصنیف ہے۔ اس کے مشتملات کی بنا پر اس کی طرف یہ تینوں نام معانی القرآن، غریب القرآن اور مجاز القرآن منسوب ہوگئے ہیں۔ یہ تالیف دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں سورۃ الفاتحۃ تا الکھف اور دوسری جلد میں سورۃ مریم تا الناس کے قرآنی مجازات کی توضیح و تشریح ہے۔[۲۴]

ابن ندیم، خطیب بغدادی، ابن الانباری، یاقوت، ابن خلکان اور سیوطی وغیرہ نے ابو عبیدہ کی اس تالیف کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ یاقوت کہتے ہیں کہ ابو عبیدہ نے مجاز القرآن ۱۸۸ھ میں تالیف کی اور اس کی وجہ تالیف خود ابو عبیدہ کی زبانی یہ بتائی ہے کہ فضل بن ربیع کی طلب پر وہ ۱۸۸ھ میں بغداد گئے تو اسے ایک عالی شان مجلس میں شاہانہ کروفر کے ساتھ تشریف فرما دیکھا، اسی اثنا میں ایک شخص آیا جسے فضل نے میرے پاس بٹھا کر پوچھا کہ کیا تم ان سے متعارف ہو؟ اس نے کہا نہیں، فضل بن ربیع نے کہا کہ یہ بصرہ کے علامہ ابو عبیدہ ہیں، ان کی تشریف آوری ہمارے لیے باعث اعزاز و سعادت ہے۔ ہم ان سے اپنی علمی تشنگی بجھائیں گے، اجنبی شخص ان کی تعریف کرتے ہوئے بولا کہ مجھے خود آپ سے ملاقات کا بڑا اشتیاق تھا۔ میں نے آپ سے ایک مسئلہ دریافت کیا تھا اگر اجازت ہو تو یاد دہانی کرا دوں ابو عبیدہ نے بطیب خاطر التفات کیا۔ اس شخص نے اس آیت کریمہ "طلعھا کانہ رؤس الشیاطین"[۲۵] (ترجمہ: اس (شجر زقوم) کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔) کو پیش کرکے

اپنا یہ اشکال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے اور وعیدیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے اس قول کا کیا مطلب ہوگا۔ ابو عبیدہ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کے کلام کے مطابق ہی ان سے گفتگو کی ہے، پھر امرؤ القیس کا یہ شعر اپنے موقف کی تائید و وضاحت میں پیش کیا:

ایقتلنی والمشرفی مضاجعی و مسنونۃ زرق کانیاب اغوال[۲۶]

(کیا وہ مجھ سے جنگ کرے گا حالانکہ شامی تلوار اور شیاطین کے دانتوں کی طرح انتہائی تیز (ہیبتناک) نیزے میرے ساتھ ہیں)

ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ اہل عرب نے "اغوال" نہیں دیکھے تھے لیکن ان کی وحشت و ہیبتناکی کا نقش ان کے دل و دماغ پر ثبت تھا۔ پھر وہ فرماتے ہیں کہ فضل بن ربیع اور سائل دونوں نے ہی اس وضاحت کو مستحسن قرار دیا اس کے بعد میں نے قرآن سے متعلق ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کا ارادہ کرلیا جس سے لفظی پیچیدگیوں کی عقدہ کشائی ہوسکے۔ چنانچہ جب میں بصرہ لوٹا تو اس کتاب کی تیاری میں لگ گیا جو بالآخر مجاز القرآن کی شکل میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔[۲۷]

اس کتاب کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ اس کے اندر قرآنی مجازات کو واضح کیا گیا ہے، اس لیے اس کا نام مجاز القرآن ہی رکھنا مناسب تھا، ابو عبیدہ جگہ جگہ آیات کی تاویل و تفسیر میں مجازہ کذا، تفسیرہ کذا، معناہ کذا، غریبہ کذا، تقدیرہ کذا اور تالیفہ کذا کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، گویہ مختلف تعبیریں ہیں مگر ایک ہی معنی کے لیے آئی ہیں۔

مجاز القرآن کی حسب ذیل خصوصیات ابو عبیدہ کو اس کے معاصرین میں ممتاز بناتی ہیں۔

۱۔ نصوص کے سلسلے میں ابو عبیدہ کا آزاد پسندانہ رجحان۔ ابو عبیدہ کے اس تفسیری منہج سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ قرآنی صداقتوں کو اپنے فہم و دانش کی کسوٹی پر پرکھتے تھے اور یہ غلط فہمی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ قرآنی آیات کی تعبیر و توضیح میں وہ اپنے مخصوص افکار

وخیالات کے ہی حصار میں رہے ہیں۔ آزاد پسندانہ رجحان سے مراد صرف یہ ہے کہ لغوی مشکلات کو رفع کرنے اور مجازی مفہوم کو واضح کرنے میں کوفہ اور بصرہ دونوں مکتبۂ فکر کی بندشوں سے آزاد ہوکر ابوعبیدہ نے قرآن کی لغوی توضیح پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔

۲۔ ابوعبیدہ نے اپنی اس تالیف میں عربوں کے خزینۂ اشعار کو پیش نظر رکھا ہے اور جابجا اپنی لغوی تشریحات میں احادیث، اشعار عرب، خطب، امثال اور اقوال سے مدد لی ہے۔

۳۔ آیات کی تاویل و توضیح میں بیجا طوالت سے کام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ قرآن کی لغوی باریکیوں پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے۔ اسی بنا پر قصص اور دوسری تفصیلات سے گریز کیا گیا ہے، یہاں تک کہ آیات کے اسباب نزول پر بھی کلام کرنے سے احتراز کیا گیا ہے، البتہ جہاں نص کو سمجھنے میں دقت معلوم ہوتی ہے وہاں بالاختصار اسباب پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

۴۔ یہ کتاب اپنی ندرت کی بنا پر بالخصوص دوسری اور تیسری صدی ہجری کے علمائے ادب کے لیے لغت کے سلسلے میں نقوش راہ بنا رہی۔ چونکہ یہ دوسری صدی کے نصف آخر میں منظر عام پر آگئی تھی اور اس وقت تک اس حیثیت سے کوئی مرتب کام نہیں ہوا تھا۔ اسلیے ابوعبیدہ کا قرآن کریم سے شغف اور اس کی یہ لغوی خدمات متاخرین کے لیے شمع راہ ثابت ہوئیں۔

۵۔ قرآن مجید کی لغوی خدمات پر یہ پہلی قابل قدر تالیف ہے۔

ابوعبیدہ کے نزدیک قرآن مجید عربی زبان کے تمام پہلوؤں اور کلام عرب کی تمام خصوصیات کا جامع ہے۔ اس طرح وہ اعراب و معانی کی خصوصیات سے بھی مزین ہے جن کو ابوعبیدہ نے مثالوں سے واضح کیا ہے۔ مقدمۂ کتاب کے بعد انہوں نے کلمۂ "مجاز" کے خطوط واضح کرتے ہوئے سورتوں کی ہبوطی ترتیب کا ذکر کیا ہے۔

"مجاز القرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجاز ہی ان کی تالیف کا اصل محور ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ تفسیر کا عام معنی لفظ ہے اور نہ ہی معنی کا، لیکن خود اس کے مفہوم تک رسائی کے لیے معنی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ابوعبیدہ کو یقین ہے کہ قرآن پاک کے اندر جو مجازات استعمال ہوئے ہیں اہل عرب ان سے نا آشنا نہیں تھے، کیونکہ اس کا کوئی ادبی پہلو عربوں کے لیے نامانوس نہیں تھا، اس لیے اہل عرب کو قرآنی مجازات سے واقفیت کے لیے کسی کتاب کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ قرآن پاک نے ادب کے مروجہ اصولوں سے کہیں انحراف نہیں کیا ہے، مجاز دراصل علم بلاغت کی اصناف و اقسام میں داخل ہے مثلاً:

التقدیم والتاخیر: ابوعبیدہ اپنے مقدمۂ کتاب میں ذکر کرتے ہیں کہ مجاز کی قسموں میں الفاظ کا موخر اور مقدم کرنا بھی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فاذا انزلنا علیها الماء اهتزت وربت"[28] (پھر جہاں ہم نے اس پر مینھ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی) یہاں مراد ربت واهتزت ہے، دوسری جگہ فرمایا "وهم بربهم یعدلون"[29] (وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر عدل و قسط کا رویہ اختیار کرتے ہیں[1]) ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ دراصل یہ "یعدلون بربهم" ہے۔ ابوعبیدہ اپنے موقف کی وضاحت میں ایک جاہلی شاعر کا یہ شعر پیش کرتے ہیں:

کان هنداً ثنایاها وبهجتها   یوم التقینا علی ادحال دباب

(جنگ کے لیے مخصوص طریقے سے تیار کیے گئے) گڑھوں کے قریب مڈبھیڑ کے دن ہند کے دونوں دانت اور ان کی دلفریبی ایک تیز و طرار جنگی آلے کی طرح جلوہ نما ہوئی)

یہاں کان ہنداً ثنایاها دراصل کان ثنایا ہندٍ ہے۔ جسے مجازاً مقدم کر دیا گیا ہے۔

---

[1] معارف: مضمون نگار نے آیت، حوالہ اور ترجمہ سب غلط لکھا ہے اصل آیت یوں ہے ثم الذین کفروا بربهم یعدلون (انعام:۱) صحیح ترجمہ یہ ہے، پھر بھی یہ کافر اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو برابر کیے دیتے ہیں۔

التشبیہ: مجازات کی بحث میں تشبیہ کا بھی خاص مقام ہے غالباً ابوعبیدہ نے کتاب المجاز کے اندر پہلی مرتبہ یہ کلمہ اس آیت کریمہ کی وضاحت میں استعمال کیا ہے:

نساؤکم حرث لکم [۳۰] (تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں)

یعنی عورت اور مرد کے درمیان کسان اور کھیت کا تعلق ہے جس طرح کسان کھیت کو تفریح گاہ قرار نہیں دیتا اسی طرح عورت مرد کے لیے محض جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ نہیں ہے۔

التمثیل:- اسے ابوعبیدہ مطلقاً تنبیہ یا تمثیل کی تشبیہ کہتے ہیں۔ قرآن پاک کی یہ آیت اس سلسلے میں وہ پیش کرتے ہیں:

افمن اسس بنیانہ علی تقوی من اللہ و رضوان خیر ام من اسس بنیانہ علی شفا جرف ھار فانھار بہ فی نار جھنم [۳۱] (کیا بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جاگری)

ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ یہ تمثیل مجاز ہے۔ کیونکہ جس عمارت کی بنیاد خوف خدا پر ہوگی وہ مضبوط تر ہوگی اور اس کے برعکس جس کی بنیاد کفر و نفاق پر رکھی گئی ہو وہ انتہائی کمزور ہوگی۔ پس اللہ پاک کے خوف و خوشنودی پر عمارت کی بنیاد دراصل تمثیل ہے، مضبوطی و استحکام کی اور یہ ایمان کی علامت ہے۔ اور "شفا جرف ھار" پر بنیاد رکھنا تمثیل ہے، ایسے کمزور، بے وزن اور بے بس ہونے کی جو سیلاب سے ڈھ جاتا ہے اور یہ کفر و نفاق کی روش سے عبارت ہے۔ [۳۲]

الاستعارہ: کلمۂ مجاز کا اطلاق استعارہ کے معنی پر بھی ہوتا ہے، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے اس قول میں دیکھی جاسکتی ہے:

ویثبت بہ الاقدام [۳۳] اور وہ اس کے ذریعہ تمہارے قدم جمادے۔

ابوعبیدہ کے نزدیک اس کا مجازی مفہوم یہ ہے کہ ان پر صبر و شکر کے جذبات طاری ہوتے ہیں اور پھر اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ثابت قدم ہوجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ملاحظہ فرمائیں:

وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی [۳۴] حقیقت یہ ہے کہ تونے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔

ابوعبیدہ کے بقول اس کا مطلب یہ ہے کہ کامیاب تو اپنے بل بوتے پر نہ ہوا بلکہ اللہ واحد کی ہی ذات تھی جس نے تیری نصرت فرمائی اور پھر تو کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

قرآن مجید میں اکثر استعاروں اور تشبیہات کا تعلق ذات باری اور دیگر عقائد سے ہے۔ اس لیے ان کے افہام و تفہیم میں دشواری ہوتی ہے۔ ان استعارات و تشبیہات میں ابوعبیدہ کا موقف نحویوں اور لغویوں سے انحراف پر مبنی نہیں ہے۔

الکنایۃ: کنایہ بھی وہ ادبی پہلو ہے جو "مجاز القرآن" کے متعدد صفحات میں زیر بحث آیا ہے۔ کنایہ کے اندر مطلوب و مقصود چیز مخفی ہوتی ہے اور یہ کنایہ دراصل ادبی اسلوب کا ایک فن ہے جو بلاغت کی دنیا میں اچھی طرح معروف ہے۔ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد "او جاء احد منکم من الغائط" [۳۵] (یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کرکے آئے) ابوعبیدہ کے نزدیک یہ کنایہ ہے قضائے حاجت سے۔

ان ادبی نکات کے علاوہ ابوعبیدہ اسلوب قرآن کے عام مباحث یعنی ایجاز، اطناب اور حذف و اضافہ سے بھی بحث کرتے ہیں۔ یہ قرآن میں بعض حروف کو زائد مانتے ہیں، جو اس کے بعد آنے والے لغویوں اور نحویوں کے مسلک سے متضاد ہے۔ مثال کے طور پر آیت مقدسہ کے یہ الفاظ: "اذ قال اللہ یا عیسی" [۳۶] (جب اللہ تعالیٰ نے کہا، اے عیسی)

ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ اذ یہاں زائد ہے اور یہ دراصل یوں ہے" وقال اللہ یاعیسیٰ"۔

اب ہم بعض ایسی آیات پیش کرتے ہیں جن پر ابوعبیدہ نے اپنی اس تالیف میں قدرے مبسوط گفتگو کی ہے مثلاً:

وقالوا کونوا ھودا او نصاریٰ	اور یہودی کہتے ہیں یہودی ہو تو
تہتدوا قل بل ملۃ ابراھیم	راہ راست پاؤ گے اور عیسائی کہتے
حنیفا[۳۷]	ہیں عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ ان سے
	کہو نہیں بلکہ طریقۂ براہیمی ہی معتبر ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں یہودیت وعیسائیت کے علمبرداروں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ رشد وہدایت کا منبع وماخذ یہودیت وعیسائیت نہیں ہے۔ چونکہ وہ خود اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ حق پر تھے اس لیے ان کے اس عقیدے کی بنا پر خود ہی یہ خیال باطل قرار پایا کہ پروانۂ نجات یہودیت وعیسائیت یا کسی خاص گروہ میں شامل ہوجانے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایک طرف ان کے زعم باطل پر ضرب لگائی گئی ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت ان کے گوش گزار کرائی جاتی ہے کہ طریقۂ ابراہیمی اختیار کرنا ہی ہدایت کی شاہراہ پر گامزن ہونا ہے۔ مولانا مودودی اس آیت کی تفسیر سے متعلق رقمطراز ہیں:

"یہودیت وعیسائیت کے عقیدۂ براہیمی کو صحیح تسلیم کرلینے کے بعد یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار ان مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں۔ دراصل اس کا مدار اس عالمگیر صراط مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت یاب رہے ہیں"[۳۸]

ابوعبیدہ لغوی پہلو پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ" بل ملۃ ابراھیم" میں فعل محذوف ہے۔ گویا پوری بات یوں ہوگی" بل اتبعوا ملۃ ابراھیم" یا" علیکم ملۃ ابراھیم" اور "حنیفا" کی وضاحت میں گویا ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں حنیف اس شخص کو کہا جاتا تھا جو دینِ ابراہیمی پر قائم رہتا تھا۔ جن لوگوں نے ختنے کرائے اور حج بیت اللہ کیا لیکن وہ بتوں کی عبادت کرتے رہے وہ کہتے تھے کہ ہم تو براہیمی طریقے پر ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ حج بیت اللہ اور ختنہ کے علاوہ دین براہیمی سے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور اب حنیف مسلم کو کہا جاتا ہے جو تمام ہی معبودوں سے کٹ کر اپنا رشتہ اللہ واحد سے استوار کرتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے ابوعبیدہ ذوالرمۃ کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

اذا حوّلَ الظِلّ العشیُّ رائیتہ حنیفاً وفی قرنِ الضُّحی یتنصرُ[۳۹]

(جب رات کی ابتدائی تاریکی (یا دن کا آخری حصہ) سائے کو زائل کردیتی ہے تو تم اسے سیدھا پاتے ہو اور وہ چاشت کے وقت دن کی ابتدا میں نصرانی ہوجاتا ہے)

"والراسخون فی العلم یقولون آمنا"[۴۰] (اور علم میں جو پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے) ابوعبیدہ کے بقول" الراسخون فی العلم" سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم کے زیور سے آراستہ اور ایمان وایقان کی نعمت سے بہرہ ور ہوکر اپنے آپ کو راسخ کرلیتے ہیں۔" تاویل" سے مراد التفسیر المرجع اور المصیر ہے۔ دراصل تاویل وتفسیر سے متعلق تین مذاہب ہیں، علماء کا ایک طبقہ تو وہ ہے جو تاویل اور تفسیر کو ہم معنی سمجھتا ہے۔ دوسرا طبقہ تاویل کو خاص اور تفسیر کو عام سمجھتا ہے۔ علماء کا ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جو تاویل وتفسیر ان دونوں کو دو متضاد چیزیں قرار دیتا ہے۔ ابوعبیدہ پہلے طبقہ کی حمایت میں ہیں۔ وہ تاویل وتفسیر دونوں کو یکساں سمجھتے ہیں۔ اپنے اس موقف کی تائید میں اعشیٰ کا یہ شعر

نقل کرتے ہیں:

علی انها کانت تأول حُبّها   تأول ربعی السقاب فاصبحا[۴۱]

(اس کے باوجود اس کی محبت کی تفسیر اونٹنی کے اس نوزائیدہ بچے کی طرح ہے جو کہ سنی تک پہنچ کر اپنی ماں (اونٹنی) کے مانند ہو جاتا ہے)

اعشیٰ کے شعر میں واقع تاول کے سلسلے میں ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ "تاول حبها" کا مطلب تفسیر حبها ہے۔ یعنی یہ کہ دل کی دنیا میں محبت کا قصر چھوٹا دکھائی دیتا ہے لیکن یہ ہمیشہ رو بہ ترقی رہتا ہے، یہاں تک کہ یہ محبت عظیم ہو جاتی ہے اور اثر و رسوخ کی حامل قرار پاتی ہے[۴۲]

قال الحواریون نحن انصار الله[۴۳]   حواریوں (اللہ کے چیدہ بندوں) نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار۔

جب حضرت عیسیٰؑ کو یقین ہو گیا کہ بنی اسرائیل کے کھلتے پیتے لوگ کفر و شرک اور عناد و سرکشی پر مصر ہیں تو آپؑ نے دوسرے بندگانِ خدا کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا اور انہیں اللہ کی راہ میں جہاد پر ابھارتے ہوئے کہا "کون ہے جو اللہ کی خاطر میرا معاون ہوگا" تو پسماندہ لوگوں نے آپؑ کی دعوت پر لبیک کہا اور انہوں نے نحن انصار الله کی صدائیں بلند کیں۔ آیت کریمہ میں "حواری" کا لفظ تحقیق طلب ہے۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں "الحواریون" معناه "صفوة الانبیاء الذین اصطفوهم" یعنی وہ چیدہ گروہ جسے انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت کا خاص حرکز بنایا اور اللہ کی راہ میں ایثار و جاں سپاری کے لیے منتخب کر لیا[۴۴] ابو عبیدہ ایک دوسرے عرب کا قول نقل کرتے ہیں کہ اس سے قصارون بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور حواریات وہ عورتیں ہیں جو شہروں میں قیام پذیر ہونے کے بجائے گاؤں کو آباد کرتی ہیں۔ ابو عبیدہ ابو جلدة الیشکری کا یہ شعر پیش

کرتے ہیں۔

فقل للحواریات تبکین غیرنا   ولا تبکنا الا الکلاب النوابح[۴۵]

(اور بادیہ نشین عورتوں سے کہدو کہ تم ہمارے علاوہ دوسروں پر روتی ہو اور ہم پر تو صرف بھونکنے والے کتے ہی رو دیتے ہیں۔

مولانا مودودی کا بیان ہے کہ حواری کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو ہمارے یہاں انصار کا مفہوم ہے۔ بائبل میں بالعموم حواریوں کی بجائے شاگردوں کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعض مقامات پر انہیں رسول بھی کہا گیا ہے۔ ہاں رسول اس معنی میں کہ عیسیٰ علیہ السلام انہیں تبلیغ کے لیے بھیجتے تھے۔ اس معنی میں نہیں کہ خدا نے ان کو رسول مقرر کیا تھا[۴۶] لیکن ابو عبیدہ نے جو لغوی تشریح کی ہے اس میں حواری ان چیدہ حضرات کی تعبیر ہے جنھیں انبیائے کرام اپنی دعوت کا خاص مخاطب سمجھ کر اپنے گروہ میں شامل کر لیتے ہیں اور یہی مفہوم زیادہ قرین قیاس اور معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔

"ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر[۴۷] (اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی طرف بلائے)، اس میں لفظ "امة" پر بڑی سیر حاصل گفتگو کر کے اس کی لغوی نزاکتوں کی نقاب کشائی کی ہے اور قرآن میں اس کے دوسرے استعمالات بھی نقل کرتے ہیں۔[۴۸] مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ان ابراهیم کان امة قانتا لله حنیفا" (واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم اپنی ذات میں ایک پوری امت تھا، اللہ کا مطیع فرمان اور یکسو) ابو عبیدہ کے نزدیک "امة قانتا" سے مراد کوئی گروہ یا جماعت نہیں ہے بلکہ خود ابراہیم علیہ السلام امام مطیع کی حیثیت سے مراد ہیں۔ کسی کے بارے میں اگر کہا جائے کہ فلاں شخص اس معاملے میں ایک امت ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس شخص کے اندر

بڑی ذہانت و فطانت اور قابلیت ولیاقت کا جوہر موجود ہے۔ معاملات کو اس کے حوالہ کیے جانے میں کامیابی ہے۔ ایک جگہ قرآن میں "واذکر بعد امۃ" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ابوعبیدہ کے نزدیک یہاں بھی کوئی گروہ یا قبیلہ مراد نہیں ہے بلکہ ایک مدت مراد ہے۔ "بعد امیۃ" بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں "امۃ" سے مراد اس لغوی عالم کے نزدیک نسیان ہے۔ لفظ "امۃ" سے متعلق ان وضاحتوں کے بعد وہ آیت مذکورہ کے لفظ "امۃ" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہاں امت سے مراد گروہ یا جماعت ہے[49] جس سے تقاضہ کیا گیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔

ابوعبیدہ کا موضوع مجاز القرآن تک محدود تھا، آیات کی تفسیر اور ان پر مبسوط بحث ان کے دائرے میں نہیں آتی۔ تاہم مجاز کی تشریح و وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بہت سی آیات کا مفہوم واضح ہو گیا ہے۔ انہیں چاہے طبقہ مفسرین میں شامل نہ کیا جائے مگر ان کی کتاب ادبی پہلوؤں کی وضاحت، حل لغات، نحو و بلاغت اور دوسری مشکلات کی عقدہ کشائی کے لیے مفید ہے اور اس حیثیت سے یہ ابوعبیدہ کا بڑا کارنامہ ہے۔

حواشی

[1] الشعراء: ۱۹۵ [2] ابراہیم: ۴ [3] ابن قتیبہ، تاویل مشکل القرآن (متشابہات کی بحث) [4] عبدالرحمٰن الانباری، نزہۃ الالباء، ص ۱۳۷، طبع اول [5] ابن ندیم۔ الفہرست، ص ۸۵ قاہرہ، ابوعبیدہ، مجاز القرآن، ص ۱۰، طبع اول ۱۳۷۴ھ۔ مصر (مقدمہ)، ابوالطیب عبدالواحد اللغوی کی مراتب النحویین، ص ۴۵، قاہرہ [6] کرد علی، رسائل البلغاء، ص ۱۰۲ [7] احمد امین، ضحی الاسلام، ج ۲، ص ۳۰۴، ۱۹۵۲ء، قاہرہ [8] گب، ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ، اردو دائرہ

معارف اسلامیہ، ج ۱ ص ۸۵۵ [9] بطرس البستانی۔ ادباء العرب، ج ۲، ص ۱۹۰، طبع چہارم ۱۹۵۵ء بیروت [10] کارل بروکلمان، تاریخ الادب العربی (مترجم)، ص ۱۴۵، دارالمعارف [11] ابوالحسن الاشعری، مقالات الاسلامیین، ج ۱ ص ۲۰۰، ۱۹۰۵ء، قاہرہ [12] گولڈزیہر، اے شارٹ ہسٹری آف عربک لٹریچر، ص ۱۹۷ [13] جاحظ، کتاب الحیوان، ج ۷، ص ۱۶۵ [14] الخطیب بغدادی، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۲۵۳، ۱۹۳۱ء، مصر [15] ابن عبد ربہ، العقد الفرید، ص ۴، ۹۳ [16] ابوالطیب عبدالواحد اللغوی، مراتب النحویین، ص ۶۷ [17] عبدالرحمٰن الانباری، نزہۃ الالباء، ص ۱۴۶ [18] جرجی زیدان تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، ج ۲ ص ۱۱۰، ۱۹۳۰ء، قاہرہ [19] ابوالطیب عبدالواحد اللغوی، مراتب النحویین، ص ۴۴ [20] ابن الندیم، الفہرست، ص ۸۵ [21] الزبیدی۔ طبقات النحویین بحوالہ مجاز القرآن لابی عبیدہ ص ۱۸ [22] ایضاً [23] محمد فواد سزگین۔ مقدمہ مجاز القرآن، لابی عبیدہ، ص ۱۸ [24] ابوعبیدہ اور اس کی شہرۂ آفاق تالیف "مجاز القرآن" کے جائزے کے لیے مصر سے شایع شدہ طبع اول ۱۳۷۴ھ کے نسخہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے [25] الصافات: ۶۵ [26] یاقوت، ارشاد الاریب، ص ۱۶۰ [27] دیوان امراء القیس، ص ۳۳، دارالمعارف، مصر [28] الحج: ۵ [29] الانعام: ۱۵۱ [30] البقرہ: ۲۲۳ [31] التوبہ: ۱۰۹ [32] ابوعبیدہ مجاز القرآن [33] الانفال: ۱۱ [34] الانفال: ۱۷ [35] النساء: ۴۳ [36] آل عمران: ۵۵ [37] البقرہ: ۱۳۵ [38] ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ج ۱ ص ۱۱۵، ۱۹۶۲ء۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، دہلی [39] دیوان ذی الرمۃ، ۳۱۶، طبع اول، ۱۳۷۸ھ، بیروت [40] آل عمران: ۷ [41] دیوان الاعشیٰ الکبیر، ص ۱۴۴، المطبعۃ النموذجیہ [42] مجاز القرآن، ص ۸۰ [43] الصف: ۱۴ [44] ابوعبیدہ مجاز القرآن ص ۹۵ [45] جمہرۃ انساب العرب، ج ۱ ص ۲۳۰ [46] ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ج ۱ ص ۲۵۶ [47] آل عمران: ۱۰۴ [48] النحل: ۱۲۰ [49] ابوعبیدہ، مجاز القرآن، ص ۱۰۰۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ایک معروف سلسلۂ حدیث

از جناب بہار الحق رضوی، رامپور

رامپور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سلسلہ کی داغ بیل مولانا سید حسن شاہ محدث رامپوری سے پڑی جو مولانا عالم علی نگینویؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ جن کا تذکرہ حافظ احمد علی خاں شوق (متوفی ۱۹۳۳ء) نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"مولوی عالم علی نگینوی بن سید کفایت علی بن سید فتح ضلع بجنور قصبہ نگینہ کے رہنے والے تھے اور مراد آباد میں مقیم تھے، طبیب، حافظ، محدث اور قاری تھے مولوی فرید الدین سہارنپوری، ملا غفران رامپوری، حافظ شبراتی، مولوی محمد رامپوری، مفتی شرف الدین رامپوری، مولانا مملوک علی نانوتوی، مولوی نوازش علی نگینوی اور مولوی تہور علی نگینوی سے علوم متداول کی تحصیل کی اور مشہور اطبائے دہلی سے طب کی تکمیل کی۔

مولانا شاہ محمد اسحق دہلوی شاگرد رشید شاہ عبد العزیز دہلوی سے سند حدیث حاصل کی۔ شاہ اسحاق دہلوی کے ارشد تلامذہ میں شمار تھا۔

بروز پنجشنبہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۲۹۵ھ کو انتقال ہوا۔

'باغ جناں باد مسکن' مادۂ تاریخ رحلت ہے۔"[1]

ولادت اور تعلیم | مولانا سید حسن شاہ محدث رامپوری بن سید شاہ احفاد سید جلال بخاری

[1] تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۰۸ مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء۔

سے تھے۔ رامپور میں محلہ زینہ عنایت خاں پیر ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ والد کے انتقال کے وقت تقریباً ۹ سال کی عمر تھی، شیخ علی بخش سے فارسی پڑھی خط نسخ و نستعلیق میں کمال حاصل کیا، علمائے وقت سے صرف و نحو اور دیگر علوم کی تکمیل کی۔ مولانا سید منیر علی بن مولوی سید رستم علیؒ، مفتی شرف الدین، مولوی غفران اور مفتی سعد اللہ سے بھی بعض علوم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد حدیث کی تکمیل کا شوق پیدا ہوا اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھا جس سے علم حدیث کے حصول کا شوق غایت درجہ ہو گیا۔

مراد آباد میں چھ سال رہ کر مولانا عالم علی نگینوی سے صحاح ستہ، مؤطا امام مالک اور شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف سبقاً سبقاً پڑھیں اور سند حاصل کی۔

مولانا حکیم سید عبد الحئیؒ کا بیان ہے:

الشیخ العالم المحدث حسن شاہ بن سید شاہ الحسینی الحنفی الرامفوری احد العلماء المشهورین بالحدیث وکان من خیار السادة النبلاء الفضلاء القادة۔ له من محاسن الاخلاق و مکارم الصفات۔ لیس لغیره مع عقل رصین ودین متین۔ واشتغال بخاصة النفس وعفاف وعزة النفس وجلالة فی القلوب و فخامة رائدة عند جمیع الناس۔

مولوی سید حسن شاہ ابن سید شاہ حسینی حنفی رامپوری علم حدیث کے ایک مشہور عالم تھے۔ سید حسن شاہ سادات کرام کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے اور بزرگی کی وجہ سے عظیم رہنما کی حیثیت اور مرتبہ رکھتے تھے، حسن اخلاق اور عمدہ صفات کے ساتھ ساتھ پختہ عقل و فہم اور دینی سنجیدگی کے حامل تھے۔ عزت نفس اور پاکدامنی اور تمام لوگوں میں ان کا احترام مسلم تھا۔

ودرس وافاد ببلدہ اربعین سنۃ	چالیس سال تک لوگوں کو فائدہ پہونچایا
اخذ عنہ ولدہ السید محمد شاہ و	اور ان سے ان کے صاحبزادے سید محمد شاہ
خلق کثیر من العلماء توفی ثمان	کے علاوہ علمار کی ایک بڑی جماعت نے
بقین من صفر سنۃ اثنتی عشرۃ	علم حاصل کیا، ۲۲ صفر ۱۳۱۲ھ میں رامپور
وثلث مائۃ والف ببلدۃ رامفور[1]	کے اندر وفات پائی۔

مولانا سید حسن شاہ کو اپنے شیخ مولانا عالم علی نگینوی سے بڑی محبت تھی اور انکا شمار مولانا نگینوی کے ارشد تلامذہ میں تھا اور موصوف بھی ان سے بہت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ مولانا سید حسن شاہ تکمیلِ علوم و حصولِ سند کے بعد بھی ہر جمعہ کو مراد آباد جا کر اپنی مشکلیں حل کرتے تھے اور مولانا نگینوی بھی اس سعادتمند شاگرد کا انتظار کرتے اور تاخیر ہو جاتی تو تشویش کا اظہار فرماتے تھے۔ سید حسن شاہ نماز جمعہ کے بعد واپس آتے۔

سید صاحب نے نہایت سادہ زندگی گزاری اور کفایت شعاری کر کے نایاب اور نادر کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا، جس میں ان کے فرزند سید محمد شاہ اور سید محمد شاہ کے فرزند سید حامد شاہ نے مزید اضافہ کیا۔

ان کو علوم دینی کے حصول کے ساتھ ساتھ سپاہیانہ ورزشوں کا شوق تھا اور لاٹھی چلانے میں یدطولیٰ حاصل تھا۔

ایک مرتبہ خواب میں نبی علیہ السلام کی زیارت ہوئی اور عرض کیا کہ میری آرزو ہے کہ میں اپنے گھر میں بیٹھ کر حدیث کی خدمت کروں۔ خدا نے یہ آرزو قبول کی اپنے مکان زینہ عنایت خاں اور مسجد زینہ عنایت خاں میں ہزاروں طلبہ کو درس دیا اور چالیس پچاس سال اس خدمت کو

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۰۸۔

انجام دیتے رہے، شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ مشہور شاگردوں میں ان کے اپنے فرزند میاں محمد شاہ، حکیم اظہر الدین امروہوی، حافظ غلام محی الدین شاہجہانپوری، مولوی سید محمد علی (نواسۂ مولوی جمال الدینؒ) میاں صاحب شاہ ولایتی، کٹھر والے میاں صاحب، حافظ محمد عمر خاں رامپوری وغیرہ نے آپ سے مکمل دورۂ حدیث کیا اور سندِ حدیث حاصل کی۔

ملا سیف الدین ولایتی، مفتی عبد القادر خاں (مفتی رامپوری)، حکیم محمد حسین خاں، حکیم محمد حسن خاں، حکیم احمد رضا خاں لکھنوی، حکیم حسین رضا خاں نے بھی بعض کتب سید صاحب سے پڑھیں۔ مکمل دورہ کرنے والوں اور چند کتب پڑھنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ پنجشنبہ کی شب ۲۲ صفر ۱۳۱۲ھ کو انتقال ہوا۔ شاہ بغدادی صاحبؒ کے مزار کے احاطہ میں جانبِ جنوب دفن ہوئے، منشی امیر احمد مینائی امیرؔ نے قطعۂ تاریخ کہا جس کا آخری شعر یہ ہے:

امیر آمد چنیں سال وصال عاشق صادق　　اُویس از مصطفیٰ آباد سوئے مصطفیٰ رفتہ = ۱۳۱۲ھ

سید صاحب کے فرزند مولوی سید حسن شاہؒ کے فرزند مولوی سید محمد شاہ نقوی رامپوری ان کے جانشین ہوئے، آپ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں محلہ زینہ عنایت خاں رامپور میں پیدا ہوئے، مولانا حکیم عبد الحئی تحریر فرماتے ہیں:

احد کبار العلماء . . . . وھو منور	ان کا شمار بڑے علمار میں تھا، شکل
الشبیہ حسن الاخلاق حلو الکلام قد	وصورت بہت خوبصورت تھی، اخلاق
غشیہ نور الایمان وسیماء الصالحین	کے بہت اچھے تھے، کلام میں شیرینی
انتھی الیہ الورع وحسن السمت	تھی، ان میں نور ایمانی کا غلبہ تھا، صالحین
والتواضع والاشتغال بخاصۃ النفس	کی نشانیاں ان میں پائی جاتی تھیں۔
واتفق الناس علی الثناء علیہ	پرہیزگاری انتہائی درجہ کی تھی۔

والمادح لشمائله[1]

عمدہ طریقہ کار، تواضع وانکسار اور احتساب نفس کی خوبیاں ان میں موجود تھیں لوگ ان کی بزرگی اور حسنِ عادات کی وجہ سے ان کی تعریف میں متفق تھے۔

حکیم مولانا عبدالحئیؒ نے آپ سے ملاقات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ میاں صاحب نے سندِ حدیث بروایت شیخ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی بذاتِ خود عطا کی۔

وله رواية عن والده عن غلام حسين عن سراج الحق عن الشيخ سلام الله الرامفوی صاحب المحلی والكمالين عن ابيه عن جده عن الشيخ المسند عبدالحق بن سيف الدين الدهلوی كما اخبرنی بلفظه ببلدة رامفور اذ لقيته بها واجازنی بذالك الطريق واعطانی ثبت الشيخ عبد الحق المذكور[2]

وہ اپنے والد سے، وہ غلام حسین سے، وہ سراج الحق سے اور وہ صاحب المحلی والکمالین شیخ سلام اللہ رامپوری سے روایت کرتے ہیں جو اپنے باپ سے اور وہ اپنے باپ سے اور وہ شیخ مسند عبدالحق بن سیف الدین دہلوی سے روایت کرتے ہیں، مجھ سے شہر رامپور میں ملاقات کے موقع پر اپنے لفظوں میں یہ بیان کیا اور اس طریق کی اجازت دی اور شیخ عبدالحق مذکور کی سند عطا کی۔

غرض مولانا سید محمد شاہؒ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی شروع کی۔ اپنے والد سے صرف ونحو کی مروجہ کتابیں پڑھیں اور فارسی کی کچھ کتابیں بھی ان سے سیکھیں، مینا بازار اور ظہوری فارسی کے مشہور

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۳۳ و ۴۳۴ [2] ایضاً ص ۴۳۴۔

عالم شیخ احمد علی سے پڑھیں، فقہ کی جملہ کتابیں اور اصولِ فقہ کی چند کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور بقیہ کتابیں اصولِ فقہ کے استاذ زمانہ مولوی عزیز اللہ خاں ولایتی سے پڑھیں اور معقولات کی تحصیل مولوی معظم شاہؒ ولایتی (شاگرد مفتی سعد اللہ) سے کی[1]

خواب علوم متداولہ کی تحصیل کر چکے تھے لیکن حدیث شریف کی باقاعدہ تعلیم شروع نہیں کی تھی کہ ایک روز خواب میں دیکھا کہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر خرمہ کا ایک درخت ہے جس سے توڑ کر خرمے کھا رہے ہیں، غیب سے آواز آئی کہ حضرت فاطمہ زہراؓ کے درخت سے خرمے کھا رہے ہو، جس کی تعبیر آپ نے یہ کی کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے مراد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا خاندان اور خرمے کے درخت سے مراد اپنے والد ماجد اور خرمے سے مراد علم الحدیث ہے۔

اس خواب کے بعد علم حدیث کے حصول کا شوق اور بڑھ گیا، مشکوٰۃ شریف، صحاح ستہ، مؤطا امام مالکؒ اور دوسری کتب حدیث نہایت محنت ولگن سے والد صاحب سے پڑھیں اور تفسیر کی کتابیں بھی اپنے والد صاحب سے پڑھیں اور مسلم شریف اپنے والد کے شیخ محترم عالم علی نگینویؒ سے پڑھیں اور اس کے بعد درس دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

قیام بنارس جس زمانہ میں نواب محمد علی خاں والیِ ٹونک معزولی کی حالت میں بنارس میں مقیم تھے انہیں دنوں نواب صاحب کے قریب کی مسجد میں محمد شاہ صاحب کا قیام تھا۔ نواب صاحب نے اپنے لڑکے عبدالوہاب خاں کو حدیث پڑھانے کے لیے کہا۔ شاہ صاحب مسجد میں بیٹھ کر عبدالوہاب خاں کو حدیث پڑھانے کیلئے تیار ہو گئے۔ نواب صاحب بھی اس پر راضی ہو گئے۔ آپ نے ان کو حصن حصین، مشکوٰۃ شریف اور شمائلِ ترمذی پڑھائیں، بنارس سے گھر آئے

---

[1] ابو یحییٰ امام خان نوشہروی: تراجم علمائے اہل حدیث، ص ۵۰۴ تا ۵۰۶، جید برقی پریس دہلی ۱۹۳۸ء تذکرۂ کاملان رامپور، ص ۳۵۷۔

اور خواب میں دیکھا کہ سید معصوم صاحب کی مسجد کے بالاخانہ پر جو ضلع مالدہ بنگال میں ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ حدیث شریف کا درس دے رہے ہیں، سید صاحب نے عرض کیا کہ نواب صاحب کے لڑکے کو پڑھانے بنارس جاتا ہوں، یہ امر مجھ پر شاق ہے۔ آپ دعا فرمائیے کہ میں گھر پر درس دیا کروں۔ شاہ صاحب نے فرمایا "اچھا" اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ اس کے بعد آپ بنارس نہیں گئے اور گھر پر درس دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا، کچھ عرصہ بعد مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی کی تحریک پر ان کا تعلق مدرسہ عالیہ رامپور سے ہو گیا اور مدرسے میں حدیث کے طلبہ کو درس دینے لگے۔ نواب خلد آشیاں کے بعد مدرسے میں انگریزی افسران کی آمد شروع ہو گئی جو معائنہ کے لیے آتے، درس کے دوران نہ خود سید صاحب ان حکام کی تعظیم و تکریم کرتے اور نہ طلبہ کو تعظیم کرنے دیتے، اس وجہ سے مدرسے کی خدمات سے علیحدہ کر دیے گئے اور ریاست کی جانب سے گھر پر تعلیم دینے کے لیے کہا گیا لیکن مدرسہ سے تنخواہ مقرر کر دی گئی اور طلبہ کے وظیفے بھی مدرسے کی طرح مقرر کیے گئے، جس کو انہوں نے ریاست کی جانب سے مجبور کرنے پر قبول کر لیا۔ اس کے بعد ان کے درس کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی، دور دور سے طلبہ آتے اور سیراب ہو کر جاتے۔ آخر دم تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ تقریباً پچاس برس تک گھر پر بیٹھ کر علم حدیث کی شمع کو روشن رکھا۔ ہندوستان اور بیرون ہند سے طلبہ پروانہ وار آتے اور روشنی حاصل کر کے واپس جاتے۔ انکے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے جن میں سے چند مشہور شاگرد یہ ہیں۔ شمس العلماء مولوی منور علی محدث، حافظ وزیر صاحب محدث، حافظ عبدالوہاب خاں محدث، میاں نزاکت علی صاحب، ملا عظیم الدین بنگالی، مولوی محمد رضا خاں، مولوی عبدالکریم ولایتی مدرس حیدر آباد دکن، مولوی مجاہد الدین سلہٹی، مولوی عبدالواحد ولایتی، مولوی عبدالعلی قاضی زادہ سواتی، مولوی محمد درویش بنگالی،

قاضی غلام احمد ملتانی شافعی مدرس اول مسجد جامع بمبئی، مولانا سالم لکھنوی، مولوی شرافت اللہ اور شاہ صاحب کے فرزند میاں حامد شاہ صاحب اور صاحبزادہ الطاف علی خاں عرف میاں جان خاں معروف ہوئے۔

ان کے علاوہ نا تمام کتب سیکڑوں نے پڑھیں۔ صورت سے نور مجسم معلوم ہوتے تھے، اخلاق نہایت وسیع، علم میں بے مثال، امور خیر میں ساعی رہتے تھے اور اپنے ملنے والوں کی مدد فرماتے تھے۔ بحر التعاوم شرح عین العلم اردو میں نواب محمد علی خاں بہادر والی ٹونک کی خواہش پر لکھی جو ۱۳۰۲ھ میں طبع ہوئی اور ۶۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا سید محمد شاہ صاحب اکثر کلکتہ تشریف لے جاتے تھے۔ کلکتہ کے فارغ التحصیل طلبہ نے سید صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان سے عرض کیا کہ آپ دوران قیام حدیث شریف کا سبق دیا کریں۔ سید صاحب راضی ہو گئے اور ترمذی شریف کا درس شروع ہو گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی اس درس میں شریک ہوئے اور اس طرح مولانا آزاد کو بھی سید صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ مولانا آزاد کا تاثر ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

"اس زمانہ میں اگرچہ سرسید کی تصانیف کے مطالعہ کی وجہ سے میرے دماغ میں ایک نیا طوفان اٹھ چکا تھا اور علماء کی جانب سے بدظنی اور انکار پیدا ہو چکا تھا مجھ پر مولوی محمد شاہ کا بہت ہی اچھا اثر پڑا، ان کی بزرگانہ صورت بڑا ہی نرم و متین لہجہ اور پر محبت تخاطب اور صاف صاف سیدھی سیدھی باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں، میں نے دیکھا اس وقت پڑھا رہے تھے اور کسی حدیث کے سلسلے میں سورۃ والعصر کی تفسیر بیان کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ جو اساسی عقائد ہیں انکے تحفظ کے بعد کسی کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔"

مولانا آزاد دوسری جگہ بیان فرماتے ہیں:

"مجھے ان کی سیدھی سادی باتیں اور بے لاگ طریق بیان اور مولوی نذیر الحسن کی تھکا دینے والی لسانیوں کے مقابلہ میں بڑی دھیمی اور نرم باتیں اتنی اچھی معلوم ہوئیں کہ میں چپکے سے دوسرے روز گیا اور کہا کہ جتنے دن آپ کا قیام ہو مجھے ایک گھنٹہ دیدیجئے، میں آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں، مجھ کو ایک بالکل کمسن لڑکا دیکھ کر ان کو بہت تامل ہوا لیکن کچھ تو والد مرحوم کا نام سن کر اور کچھ تھوڑی دیر گفتگو سے اندازہ کر کے پوری رضامندی ظاہر کی اور مجھ سے کہا کہ ترمذی شریف ہی میں شریک ہو جاؤ، چنانچہ میں تقریباً دو مہینہ تک پڑھتا رہا۔"

مولانا آزاد کے بیان کے مطابق ان کا درس بہت سادہ اور محدود تھا اور ان سے استفادہ کی مدت بھی صرف دو ماہ تھی لیکن یہ سادہ اور محدود درس اور چند دن کی صحبت بھی بے اثر نہیں کہی جاسکتی اور مولانا آزاد نے جتنا اثر چند دن کی صحبت سے لیا دوسرے اساتذہ کی طویل اور برسوں کی صحبت سے بھی نہیں لیا۔

شاہ صاحب حنفی المذہب تھے اور بقول مولانا آزاد مسلک حنفیہ کے ثابت کرنے پر زور دیتے تھے۔ ان کو تصوف سے بھی لگاؤ تھا سلسلۂ قادریہ میں اپنے والد ماجد مولانا سید حسن شاہؒ سے اور سلسلہ نقشبندیہ میں شیخ کرامت علی جونپوری سے بیعت تھے اور ایک زمانہ تک موصوف کی صحبت میں رہے۔ دلائل الخیرات کی اجازت شیخ عبدالسلام بدایونی مولوی شمس الاسلام بدایونی کے والد سے حاصل کی، قصیدۂ بردہ، حرز یمانی، اسمائے اہل بدر اور حزب البحر اپنے والد کو سنا کر اجازت حاصل کی۔ سفر و حضر میں اپنے والد کی خدمت میں رہے۔

انہوں نے بہت سے سفر کیے اور جس مقام پر جاتے وہاں کے اہل اللہ کے مزارات پر

حاضری دیتے اور فاتحہ پڑھتے۔ اجمیر، دہلی، آگرہ، کرنال، گنگوہ، جونپور، گلبرگہ دکن اور دیگر متعدد مقامات کے سفر کیے۔ ندوۃ العلماء کے جلسوں میں شریک ہوئے اور ندوہ کی تحریک میں کافی دلچسپی لی۔ صدارت کے لیے ان کا نام علامہ شبلی مرحوم نے پیش کیا جس کی تائید مولانا محمد حسین بٹالوی نے کی، مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی[۱] میں مولوی محمد شاہ صاحب سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے کہ رامپور میں ایک اتفاقی سفر کے دوران سید محمد شاہ صاحب کی زیارت سے مشرف ہوئے اور اس وقت موصوف (دیوان ملّی) کا نسخہ صاف کر رہے تھے۔

۲۲ شعبان چہارشنبہ کے دن ۱۳۳۸ھ میں شاہ صاحب کا انتقال ہوا بغدادی صاحبؒ کے مزار میں چبوترہ پر جانب شمال دفن ہوئے۔ سید جلیل حسن جلیل مانک پوری کا کہا ہوا قطعہ تاریخ وفات مزار پر کندہ ہے جس کا آخری شعر یہ ہے:

ثبت بر لوح مزارش کن جلیل — وارث دین رسول دوسرا

مولوی قاضی محمد حامد شاہ صاحب ۱۳۳۸ھ محدث آپ کے فرزند جانشین ہوئے، یہ ایک مشہور عالم، محدث، فقیہ اور رامپور کے قاضی شہر تھے، ان کا شمار شہر کے معززین میں تھا، ۱۸۸۹ء میں محلہ زینہ عنایت خاں رامپور میں پیدا ہوئے۔ قاضی سید حامد شاہ نے بیادگار حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ ایک مدرسہ مدرسہ عزیزیہ کے نام سے ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶-۰۷ء میں قائم فرمایا اور اس مدرسہ میں حدیث شریف کا درس خود بھی اپنی ساری عمر دیا اور دوسرے علمائے وقت کو حدیث، فقہ اور دیگر علوم کی تعلیم کے لیے مقرر کیا۔

حامد شاہ صاحب کے انتقال یکم صفر ۱۳۵۵ھ/ ۲۳ اپریل ۱۹۳۶ء کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے مولوی سید احمد شاہ نقوی قاضی شہر ہوئے۔ وہ پہلے سے مدرسہ عالیہ میں

---

[۱] ص ۳۰۷۔

حدیث شریف کا درس دیتے تھے۔ مدرسہ عزیزیہ کے مہتمم حامد شاہ صاحب کے دوسرے صاحبزادے سید محمود شاہ ہوئے، نادر اور نایاب کتابوں کا ذخیرہ جو سید حسن شاہ صاحب اور مولوی سید محمد شاہ صاحب نے جمع کیا تھا، اس کا تحفظ اور نگرانی بھی قاضی صاحب نے اپنے ذمہ لی۔

ہندوستان کے طول وعرض میں ہر جگہ مولوی سید محمد شاہ کے شاگرد گئے، جنھوں نے حدیث کی شمع کو روشن کیا، ان کی زندگی میں ہی ان کے شاگردوں کی کافی تعداد تھی جن کی شہرت خوب ہو چکی تھی اور بطور محدث وعالم مشہور ہو گئے تھے، ان کے شاگردوں میں شمس العلماء مولوی منور علی رامپوری کی شہرت بہت ہوئی۔ مولوی منور علی نے سید صاحب سے حدیث کی تکمیل کی اور سند حاصل کی۔ وہ مدرسہ عالیہ میں درجۂ حدیث کے استاذ مقرر ہوئے اور ان کے کثیر شاگرد ہوئے، ان کا طریقہ تھا کہ جب مدرسہ عالیہ میں تعلیمی سال شروع ہوتا اور درجۂ حدیث میں طلبہ داخل ہوتے تو پہلے سبق کے لیے ان کو سید صاحب کے مکان پر لے جاتے اور خود طلبہ کی صف میں بیٹھ کر اپنے استاد سے طلبہ کو حدیث شروع کراتے اور اس کے دوسرے روز سے مدرسہ عالیہ میں سبق کا سلسلہ شروع ہوتا۔

مولوی منور علی شاگرد مولانا سید محمد شاہؒ کا تذکرہ بھی مولانا عبدالحئی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"الشیخ العالم المحدث منور علی بن مظہر الحق الحنفی الرامفوری
احد العلماء المشہورین[1]

مادۂ تاریخ وفات "مرقد آفتاب حدیث" ہے۔ ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ کو انتقال ہوا۔

سید صاحب کے دوسرے اہم شاگردوں میں حافظ محمد وزیر محدث تھے۔ سید صاحب

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۸، ص ۴۸۳۔

حافظ وزیر کو بہت چاہتے تھے اور اکثر طلبہ کو حدیث اور دیگر علوم کے لیے حافظ محمد وزیر کے پاس بھیجتے تھے اور ان کو مولوی منور علی سے کسی طرح کم نہیں سمجھتے تھے۔

ان کے علاوہ مولانا عبدالواحد سواتی۔ مولوی محمد امین صاحبزادہ الطاف علی خاں۔ مولوی عبدالغفور سواتی (جو بیس سال تک ڈابھیل میں حدیث شریف کا درس دیتے رہے) مولانا حافظ عبدالوہاب خاں۔ مولوی نجم الغنی خاں اور خود آپ کے فرزند مولانا سید حامد شاہ (قاضی شہر رامپور) شہرت وعظمت کے مالک ہوئے۔

ان کے شاگردوں میں مولوی منور علی حافظ محمد وزیر، حافظ عبدالوہاب خاں نے مدرسہ عالیہ میں حدیث شریف اور دوسرے علوم کے درس دیے۔

مولوی منور علی کو انھوں نے اپنی زندگی میں رامپور سے باہر جانے نہیں دیا، حالانکہ اکثر مقامات سے ان کو بلایا گیا۔ سید صاحب کے انتقال کے بعد وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی اور حدیث کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

سید محمد شاہ صاحب کے شاگرد مولانا حافظ عبدالوہاب خاں کافی شہرت کے مالک اور مشہور مدرس ہوئے۔ سید صاحب کی حیات میں آخری وقت بطور طالب علم حاضر ہوتے اور مسند امام احمد بن حنبل سبقاً سبقاً سناتے۔ صاحب نزہۃ الخواطر رقمطراز ہیں:

الشیخ الصالح عبدالوہاب بن	عبدالوہاب خاں بن حافظ عمر خاں
محمد عمر خاں الحنفی الرامفوری	حنفی رامپوری علمائے صالحین میں
احد العلماء الصالحین وکان	سے تھے، عالم اور زاہد اور بہت
عالماً زاهداً کثیر القناعة	قناعت پسند تھے، نیکیوں کا حکم دیتے
آمراً بالمعروف ناهیا عن الشرک	تھے اور شرک وبدعت سے روکتے تھے

والبدعة ملازماً لقيام الليل	تہجد گزار تھے اور مسجد میں اول وقت
فی جماعة فی مسجده محافظاً علی	جماعت کی نماز کا اہتمام کرتے تھے۔
الصلوات فی اول وقتها[1]	

آج بھی رامپور کے مدارس حدیث "جامعۃ المعارف" قائم کردہ مولانا عبدالوہاب خاں مرحوم جس کے اب صدر و مہتمم مولانا عبدالسلام خاں صاحب سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور ہیں اور جامع العلوم فرقانیہ قائم کردہ مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خانصاحب اور مطلع العلوم جس کے مہتمم اور صدر مدرس مولوی خلیل اللہ صاحب مرحوم تھے، وغیرہ میں اسی سلسلہ کی سندِ حدیث جاری کی جاتی ہے۔

اس خاندان میں درس وتدریس کے علاوہ منصبِ قضا اور امامت وخطابتِ جمعہ وعیدین بھی رہی۔ سید محمد شاہ صاحب، امام جمعہ وعیدین رہے اور ان کے فرزند مولوی سید حامد شاہ محدث اور حامد شاہ صاحب کے فرزند قاضی سید احمد شاہ محدث قاضی اور خطیب عیدین رہے۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۳۱۸ و ۳۱۹۔

معروضات

از پروفیسر معز علی بیگ۔ ہریانہ

جولائی اور اگست ۹۷ء کے معارف میں شائع ہونے والے شذرات میرے نزدیک ایک غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ نے جن احساسات کا اظہار اپنے قلم سے کیا ہے اور جو باتیں پیش کی ہیں وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مجھے جس طرح ان باتوں نے اور خصوصاً مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال پر آپ کے احساسات نے سوچنے پر مجبور کیا ہے وہ بلاکم وکاست قارئینِ معارف کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر قرآن کے فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں ہم اپنی نگاہ کو مسلمانوں کے موجودہ حالات سے بھی آگے عالمی صورتِ حال پر پھیلادیں تو غالباً یہ نظر آئے گا کہ اس وقت ابلیس کی کارفرمائی اس پر مرکوز ہے کہ کسی طرح انسان کے وجود اور اس کی شخصیت کے اندر سے تمام بلند اور روحانی اقدار کو ختم کردیا جائے اور ان کی جگہ پست اور بازاری قدروں کو لاکر اس کی خرید وفروخت کو آسان بنادیا جائے، ابلیس کے اس عمل سے مسلمان قطعاً مستثنیٰ نہیں ہیں۔

ابلیس کی دوسری سازش یہ ہے کہ انسانیت کو کسی بھی ایسے "کلمۂ سوا" اور نقطۂ اشتراک پر نہ آنے دیا جائے جو ایک عالمی معاشرے اور عالمی نظام (WORLD ORDER) کا پیش خیمہ بن سکے، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ آج ایک عالمی معاشرے اور نظام کا قیام قطعاً

ناگزیر ہے' انسانی تہذیب کے ارتقا کی یہ وہ منزل ہے جس کا ذکر ہم ابھی کریں گے اور جس کے قریب آجانے سے انسانی تاریخ کی وہ توجیہ سمجھ میں آنے لگتی ہے جو ختم نبوت ؐ کے راز پر روشنی ڈالتی ہے۔ انسانیت کی آیندہ بقا کے لیے یہ عالمی معاشرہ اور اس کا نظام اس لیے ناگزیر ہے کہ موجودہ اقوام کو یا تو اب شریف' ہمدرد' حساس' رحم دل' دیانتدار اور حساس ہمسایوں کی طرح اس کرۂ ارض پر رہنا ہوگا یا پھر وہ خودکشی کرنا ہوگی جس کی طرف انسان کا "عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" اس کو ڈھکیلتا ہوا لیے جارہا ہے۔

آج نوع انسانی کو ایک ایسے چارٹر (CHARTER) کی ضرورت ہے جو اس کے وقار کا تحفظ کرتے ہوئے اس کو رنگ' نسل' زبان' وطن پرستی اور قوم پرستی کے جذبات سے پیدا ہونے والے تعصبات سے نکال دے' یہ تعصبات آج عذاب کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

یہ بات یوں تو ایک سوالیہ نشان لگا کر ختم کی جاسکتی ہے' لیکن اگر مسلمان اپنی نگاہ کو تاریخ کی وسعتوں پر پھیلاتے ہوئے اور اپنے قلب کی قوتوں کو بروئے کار لاکر حقیقت کو دیکھنا چاہیں تو ان کو نظر آئے گا کہ اللہ کا آخری رسول ؐ عہد عتیق اور عصر جدید کے درمیان انسانی تہذیب کے ارتقا کے اس موڑ پر کھڑا ہے جہاں سے اب اس کی قسمت کا آغاز ہوتا ہے، جس تک پہنچنے کے لیے انسان کو کم و بیش سات ہزار سال کی مسافت طے کرنا پڑی۔ تہذیب کے ارتقا کا یہ وہ موڑ ہے جہاں سے زندگی اپنی وحدت کی پوری پوری توثیق کرنے والی ہے اور پچھلے سات ہزار سال کے ہر تضاد کو عبور کرنے والی ہے۔

موجودہ تہذیب کی اکھڑتی ہوئی آخری سانس یہ بتارہی ہے کہ جس چارٹر کی آج انسانیت کو ضرورت ہے وہ کسی ماورائی حقیقت کو تسلیم کیے بغیر بنایا تو جاسکتا ہے لیکن نافذ نہیں کیا جاسکتا اور اگر کبھی دیا جائے تو وہ زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہ سکتا کیونکہ انسانی فطرت نے

جو شرائط اس کے نفاذ کے لیے عائد کر دیے ہیں ان کو برطرف کر کے اس کو قائم رکھنا ممکن نہیں ہے اور ان میں شرط اول روحانی اور اخلاقی قدروں کا وہ امتزاج ہے جو ایک ماورائی حقیقت کو تسلیم کیے بغیر ہرگز ممکن نہیں ہے۔ یہی وہ امتزاج ہے جس کے بغیر زندگی آج بکھر چکی ہے اور انسان ایک بحران میں گرفتار ہو چکا ہے جس سے نکلنے کے لیے وہ فطرت کے ہر اشارے کو سمجھنا چاہتا ہے اور اس کو اپنا ایک سہارا بنا رہا ہے۔

آج سے چودہ سو اٹھارہ [۱۴۱۸] سال قبل سرزمین مکہ سے ایک ایسے چارٹر کا اعلان ہوا ہے جو ایک طویل جد و جہد کے بعد اس سرزمین پر فتح حاصل کرنے کے بعد کیا گیا جو ٹھیک اسی امتزاج پر قائم ہے۔ چنانچہ ابلیس کی اس وقت مکمل کوشش یہ ہے کہ مسلمان کے اندر کبھی بھی وہ تاریخی شعور پیدا نہ ہونے پائے جس سے وہ اس حقیقت کی اصل تک پہنچ سکے اور محض اپنی تسلی کے لیے یہ کہتا رہے کہ محمد اللہ کے آخری رسول ہیں۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ مشیت ایزدی کے تحت ختم نبوت ارتقائی عمل کا وہ لازمہ ہے جس کے ساتھ آیندہ صدی اور اس کے بعد کے عالمی معاشرے اور نظام کی تعمیر ہونے جارہی ہے۔

اس دور کے صاحب نظر مفکرین کی اکثریت اس بات پر اتفاق رکھتی ہے کہ اگر اقوام متحدہ (UNO) کے اندر بدنیتی اور گہرے تعصبات اور مکاری کے لیے چور دروازے اسی طرح کھلے رہے جو آج نظر آرہے ہیں اور جن کو (VETO) کی طاقت سے محفوظ کر دیا گیا ہے تو اس کا وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلے والی "داشتۂ پیرک افرنگ" کا ہوا۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ آیندہ نہ تو اقوام رہیں گی اور نہ ان کو متحد کرنے کے لیے کوئی باقی رہے گا۔

کاش مسلمان کی سمجھ میں یہ آجائے کہ ختم رسالت ہی وہ حقیقت ہے جو تہذیب کے اس ارتقا کی طرف اشارہ کر رہی ہے' جو ایک عالمی معاشرے کو وجود میں لانے والا ہے اور ایک

ہمہ گیر وحدت کا وہ جدلیاتی عمل جو ایک غیر ثانوی ثنویت کے ساتھ حرکت کر رہا ہے اب طبیعی اور عمرانی اور نفسیاتی علوم کے ہر ہر راستے سے اپنی توثیق کرنے والا ہے، اگر مسلمان "قلوب لا یفقھون بھا" کا شکار نہ ہوا تو اسے نظر آئے گا کہ :

کوہ را مثل پر کاہ سبک می یابم   پر کاہے صفت کوہ گراں می بینم

محترم اصلاحی صاحب !

ابلیسی قوتیں اس وقت خود ایسے تضاد کا شکار ہو چکی ہیں جس سے ابلیس لرزہ براندام ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ابلیس اس "یا ایھا الناس" کی عالمگیر آواز سے کانپ رہا ہے جو اب اس کو صاف صاف سنائی دینے لگا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے، بلکہ خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ ٹھیک اس کے پیچھے " اعبدوا ربکم " کی وہ 'ہولناک' پکار ہے جو اس کی سازشوں کے جال کے ایک ایک پھندے کو کاٹ ڈالے گی اور اس پکار کے پیچھے وہ بے پناہ قوت کام کر رہی ہے کہ " حریف اس کی نہیں عقل حکیم "۔

آج انسانی تہذیب کا عالم یہ ہے کہ " عشق ناپید خرد می گزدش صورت مار " اس وقت طبیعی علوم (PHYSICAL SCIENCES) کے ماہر، عمرانی اور نفسیاتی علوم کے ماہر[1] اور وہ فلاسفہ جو عقلیت (RATIONALISM) اور تجربیت (EMPIRICISM) کے آگے جا چکے ہیں، یہ قطعاً سمجھ چکے ہیں کہ زندگی کی وحدت کو درہم برہم کر کے یہ تہذیب اس ارتقائی عمل کی نفی کر رہی ہے جو خود عنقریب اس کی نفی کر دے گا اور یہ کہ انسان کے روحانی وجود کو دبا کر (SUPPRESS) اس نے شخصیت کو کھوکھلا کر دیا ہے۔

یہ تو ہے میری حقیر دانست میں وہ صورت حال جو غور کرنے سے نظر آنے لگتی ہے۔

---

[1] ان حضرات کے ناموں اور کاموں کی فہرست بہت طویل ہے۔

اب رہا مسلمانوں کا آپس میں متحارب ہونا تو ہمارا یہ عمل پہلی صدی ہجری سے ۱۹۹۷ء تک برابر رہا ہے اور ایک المیہ سا لگنے لگتا ہے۔ لیکن یہی معاملہ پوری انسانی تاریخ کا ہے۔

میری حقیر رائے میں مسلمان اپنا استیصال خود کر رہا ہے اور اس کو یہ ذمہ داری اپنے اوپر لینا ہوگی اور یہ بھی اچھی طرح جان لینا ہوگا کہ خالقِ ارض و سماوات کے لیے معاملہ صرف مسلمان کا نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کا ہے اور اس کے لیے " ان اللہ یاتی بقوم " صرف ایک لمحہ کا عمل ہے۔

چنانچہ علمائے کرام سے بصد احترام یہ گزارش ہے کہ وہ یہ توجہ فرمائیں کہ انسانیت کو موت کے خطرے سے نکالنے کے لیے اس چارٹر کو سامنے لانا ضروری ہے جو ایک کلمۂ سوا کی بنیاد پر انسانی وقار، شرافت اور انسانی قدروں کی بقا اور ان کے تحفظ کی ضمانت لیتا ہے اور جس کا اعلان ابھی سرزمین مکہ سے ہوا ہے۔ یہ "ابھی" ۲۰۰۰ء کو اس لمحہ سے ملانے جا رہی ہے جو ایک ہزار اٹھارہ (۱۰۱۸) برس قبل واقع ہوا ہے۔

لیکن علمائے کرام سے دوسری گزارش یہ ہے کہ انسانیت کو اس کلمۂ سوا پر قائم ہونے والے چارٹر کے اندر لانے سے پہلے وہ کہیں سے وہ کلمۂ سوا ڈھونڈ لائیں جو ان کو آپس میں ملا دے۔ اگر ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے تو پھر ہمارے لیے اس مرد درویش کی تلاش ضروری ہے جو ابلیس اور اس کی طاقتوں کو ببانگ دہل یہ چیلنج دے سکے کہ :

ہنگامے ہیں میرے تیری طاقت سے زیادہ   بچتا ہوا بنگاہ قلندر سے گزر جا

یہ تو ہنگامے ہیں جو ان طاقتوں کے ان فکری ستونوں کو ایک ایک کر کے گرا دیں گے جس پر ابلیس نے اس ہلاکت آفریں تہذیب کو قائم کیا ہے اور جس میں اس کے

لیے مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

معارف کے شذرات میں ایک جگہ ہندو احیاء پسندی اور صہیونیت کا ذکر آیا ہے۔
میری حقیر دانست میں یہ تحریکیں جس تاریخی عمل کی گرفت میں آچکی ہیں وہ ان کو معدوم (EXT-INCT) کرنے جارہا ہے۔ یہ بات میں نہ تو کسی تنگ نظری کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں اور نہ ہی فرقہ واریت کی، بلکہ ان حقائق کی بنیاد پر جن کو مدلل طور پر پیش کرنے سے ایک دوسری گفتگو شروع ہوجائے گی، جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ فی الوقت صرف اتنا عرض کردوں کہ کم از کم ہندو احیاپسندی کی تحریکوں کے ذمہ دار حضرات سے گفتگو کا وقت قریب آرہا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس ملک میں وہ اٹھی ہیں اس ملک کا سماج کچھ ایسے مصائب میں گرفتار ہے جس سے یہ تحریکیں اسے نہیں نکال سکیں گی۔ مزید یہ کہ ان کے منفی مزاج کے ساتھ ویدانت کی تعلیمات نہیں چل سکیں گی۔

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	: دار المصنفین اعظم گڈھ	پتہ :	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	: ماہانہ	نام پبلشر :	" " "
نام پرنٹر	: عبد المنان ہلالی	ایڈیٹر :	ضیاء الدین اصلاحی
قومیت	: ہندوستانی	قومیت :	ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ دار المصنفین۔

میں عبد المنان ہلالی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

عبد المنان ہلالی۔

اخبار علمیہ

چاند کی تسخیر کے متعلق علمائے فلکیات کی پیہم کوششوں کا ذکر ان صفحات میں کیا جاچکا ہے اب ایک تازہ اطلاع سے معلوم ہوا کہ چاند کی مٹی میں پانی موجود ہے جو سائنسدانوں کیلئے آب حیات سے کم نہیں، تفصیل یہ ہے کہ گذشتہ جنوری میں چاند کی جانب ایک روبوٹ گاڑی روانہ کی گئی تھی، چار فٹ لمبی اور تین سو کلوگرام وزنی اور ۶۵ ملین ڈالر کی مالیت کی اس قمری گاڑی میں ایسے آلات نصب کیے گئے تھے جن سے چاند کے فضائی عناصر نیوٹرون ذرات اور شعاعوں کا پتہ لگایا جاسکے، ان آلات کا ریڈیائی تعلق زمین پر قائم سائنسی تجربہ گاہوں سے مستقل قائم ہے جس کے ذریعہ سائنسداں چاند کے عمل انجذاب و کشش اور مقناطیسی اثرات وغیرہ کا بلا انقطاع تجزیہ کرتے رہتے ہیں، اسی عمل کے دوران چاند کے قطبین میں ایسے پہاڑوں اور چٹانوں کا وجود ملا جن کی تہہ میں جا بجا منتشر برفیلے پانی کے ذخیروں کی نشاندہی ہوئی، یہ بھی اندازہ کیا گیا کہ چاند کے قطب شمالی میں تقریباً ۱۷۳،۰۰۰ مربع کلومیٹر اور قطب جنوبی میں ۷،۰۰۰ مربع کلومیٹر میں پانی کے یہ ذخائر گیارہ ملین سے تین سو تیس ملین ٹن کی مقدار میں موجود ہیں، البتہ ابھی یہ واضح نہیں کہ یہ پانی کس حد تک مفید ہے، بہر حال یہ اطلاع سائنسدانوں کے لیے حیات بخش ثابت ہوئی جو قمر کو ایک مستقل مستقر بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے انسانی مستقر بنانے کے لیے زمین سے پانی فراہم کرنا ہوتا، لیکن اب ضرورت

دن میں پوری ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ پانی کے عناصر میں سب سے اہم عنصر آکسیجن بھی بہ آسانی فراہم ہو سکے گی اور دوسرے عنصر ہائیڈروجن کی مدد سے راکٹ کا ایندھن بھی حاصل کیا جا سکے گا، توقع ہے کہ یہ روبوٹ گاڑی اس سال کے آخر تک اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہے گی اور جب اس کا ایندھن ختم ہو جائے گا تو یہ چاند کی زمین پر گر کر فنا ہو جائے گی اس طرح مستقبل میں چاند پر جانے والی دوسری گاڑیوں کے لیے یہ فضائے قمر میں رکاوٹ بھی نہ بن سکے گی۔

چاند کو پانے کی خواہش کے ساتھ سائنسداں اپنی زمین سے بے تعلق نہیں ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ سوال آج بھی اہمیت کا حامل ہے کہ زمین کی شکل ابتدائے آفرینش کے وقت کیا تھی؟ برطانیہ کے مشہور ریاضی داں اور عالم فلکیات اسٹیفن ہاکنگ نے یہ تازہ انکشاف کیا کہ قریب بارہ بلین سال پہلے جب زمین ایک انفجار عظیم کے نتیجہ میں موجودہ شکل میں آئی تو اس سے ایک سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں اس کی شکل مٹر کے دانے کے برابر تھی، پروفیسر ہاکنگ اپنی کثیر الاشاعت کتاب اے بریف ہسٹری آف ٹائم کی وجہ سے شہرت کی بلندیوں پر ہیں اس لیے ان کی اس رائے کو بھی اہمیت دی گئی ہے

سائنسدانوں کا وظیفہ ظن و تخمین وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، زمین کی عمر ماضی قریب میں ۳۰۰۰ ملین سال فرض کی گئی تھی، بعد میں یہ مدت ۴۵۰۰ ملین سال کی ہوگئی اور اب ۱۲ ملین سال کا خیال ظاہر کیا گیا، اسی طرح زمین سے بعید ترین معلوم سیارہ کی مسافت ایک بلین نوری سال بتائی گئی تھی اب یہ ۳،۲ بلین نوری سال ہے۔ ۴۰ سال پہلے عطارد گرم ترین سیارہ تھا اب زہرہ کی گرمی اس سے ۱۵۰ ڈگری سیلسیس زیادہ بتائی جاتی ہے۔

ع۔ص۔

ادبیات

غزل

از جناب محمد عبدالقدیر، الہ آباد۔

گرمیِ افکارِ تازہ سے شفق روشن ہوئے — دھیرے دھیرے خلق پر آثارِ حق روشن ہوئے
رہ گئے ہم شب کو پلکوں پر سجا کر صبح تک — آپ کیا سمجھے کہ بس یوں ہی شفق روشن ہوئے
روشنی کی جستجو میں صرف کر دی ساری عمر — تب کتابِ زندگی کے کچھ ورق روشن ہوئے
نور سے چہروں کی جب تابانیاں رخصت ہوئیں — جس قدر چہرے تھے بے رنگ و رمق روشن ہوئے
جل اٹھی جب شمعِ عرفان و یقین و آگہی — تب کہیں انسان پر چودہ طبق روشن ہوئے
طالبانِ علم جو شب میں جلاتے تھے دماغ — بس انہیں پر علم و دانش کے سبق روشن ہوئے
اک شرارہ کیا ہوا روشن ہوا کے دوش پر — پل میں صحرائے وسیع و لق و دق روشن ہوئے

آپ نے بھی خوب چھیڑی ہے قدیرؔ ایسی غزل
جس میں سارے قافیے تنگ و ادق روشن ہوئے

غزل

از

ڈاکٹر محمد حسین فطرتؔ بھٹکلی

درد و خلش و کرب کی روداد لے گی — نغمات کی تہ میں تمہیں فریاد لے گی

اللہ کی قدرت پہ اٹل میرا یقیں ہے — حق چاہے تو دشمن سے بھی امداد ملے گی

کچھ ذاتی کمائی کے سوا ہاتھ نہ آیا — سوچا تھا عبث دولتِ اجداد ملے گی

اس دور کے تنقید نگاروں کا یہ ہے حال — کم فہموں کی ان میں بڑی تعداد ملے گی

باطل کی عمارت ہے کھڑی کچی زمیں پر — دلدل ہی پہ اس قصر کی بنیاد ملے گی

کس کو ہے مفر خونی وراثت سے جہاں میں — والد کے طریقے ہی پہ اولاد ملے گی

فطرت نہ ہو ناقدریِ احباب سے مایوس
اربابِ بصیرت سے تجھے داد ملے گی

رباعیات

از

جناب وسیم انصاری رُدولوی (مرحوم)

گلچیں گلچیں! یہ کیا ستم گاری ہے — ان پھولوں کی صورت تو بہت پیاری ہے

یہ نازِ چمن ہیں، ان پہ نازاں ہے چمن — آئینِ گلستاں سے یہ غداری ہے

مستِ مئے پندار نہیں ملتا ہے — بہکا ہوا سرشار نہیں ملتا ہے

اے رحمتِ عالم تری رحمت کے نثار — ڈھونڈے سے گنہ گار نہیں ملتا ہے

پھول اک دامنِ بہار میں تھا — سب میں ممتاز لالہ زار میں تھا

وہ ہزاروں کی آنکھ کا تارا — کسی گلچیں کے انتظار میں تھا

غنچہ میں جمالِ گل کا پوشیدہ ہے — نکہت ابھی تو پردوں میں خوابیدہ ہے

شبنم روتی ہے خندۂ گل کے لیے — گلچیں کی نظر ابھی سے دزدیدہ ہے

مطبوعات جدیدہ

دیوان جلالی احمد آبادی مرتب جناب محی الدین بمبئی والا، تصحیح و مقدمہ ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۵، قیمت ۱۱۰ روپے، پتہ: حضرت پیر محمد شاہ درگاہ ٹرسٹ احمد آباد ۱ گجرات اور مکتبہ جامعہ دہلی وغیرہ۔

اسلامی ہند کے عہد رفتہ کی یادگاروں میں احمد آباد گجرات نمایاں ہے، جہاں مساجد و مقابر و محلات کے علاوہ پیر محمد شاہ اور شاہ عالم کی درگاہیں زیارت گاہ خلائق ہیں، پیر محمد شاہ کی درگاہ اپنے نادر علمی ذخیرہ کے لیے بھی مشہور ہے اور ایک عرصہ سے اس کے ذمہ داران بعض اہم مطبوعات کے ذریعہ اس درگاہ کا فیضان عام کرنے میں مصروف ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے احمد آباد کے آسمانِ علم و فضل کے روشن ترین ستارے حضرت شاہ عالم کی نسل میں ایک اور فخر خاندان نظام الدین ابو الفتح محمد مقبول عالم پیدا ہوئے ان کی مجموعۂ کمالات و محاسن شخصیت کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ گجرات میں فارسی زبان کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں، جلالی ان کا تخلص ہے، ان کا قلمی دیوان کتبخانہ پیر محمد شاہ میں محفوظ ہے، دو اور نسخے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بھی موجود ہیں اور ایک اور نسخہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو احمد آباد کے کتبخانہ قاضی صاحب میں موجود تھا، لیکن اب غالباً دستیاب نہیں، اب تک یہ قلمی نسخہ طبع نہیں ہو سکا تھا، اس کی طباعت و اشاعت کا شرف پیر محمد شاہ ٹرسٹ کو حاصل ہوا، فاضل مرتب نے نسخۂ کلکتہ کو بھی مدنظر رکھا اور جا بجا حاشیوں میں دونوں نسخوں کے فرق کی نشاندہی بھی

کر دی، دیوان جلالی کی غزلوں میں جمالی رنگ غالب ہے، غزل کے پیرایہ میں صوفیانہ جذبات و واردات کا حظ و لطف اور سوا ہو گیا ہے اور اس سے قریباً تین سو برس پہلے کے ہندوستان کے ذوق و مزاج کا بھی اندازہ ہوتا ہے، فاضل محقق ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے قلم سے باون صفحات کا مقدمہ انگریزی زبان میں ہے جس میں جلالی کے خاندان، عہد، دیگر تصنیفات، فارسی ترجمۂ قرآن اور خود دیوان جلالی کے متعلق بڑی ژرف نگاہی سے بحث کی گئی ہے، فارسی شعر و ادب کے قدردانوں کے لیے یہ بہترین تحفہ ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت مرتب جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت مناسب، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ شاہد ۱/۹ علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۷۵۸۰۰، پاکستان۔

انگریزوں کے تسلط و اقتدار کے بعد برصغیر کے مسلمانوں میں یہ بحث شد و مد سے اٹھتی رہی کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے، چنانچہ دارالاسلام دارالحرب، دارالامن اور دارالعہد کی اصطلاحوں اور فقہاء کے آراء و اقوال سے علماء نے خاص اعتناء کیا، شاہ عبدالعزیز، مولانا گنگوہی سے مولانا سید محمد میاں تک اس موضوع پر فتاوی و مضامین سپرد قلم کیے گئے، اب یہ ماضی کی داستان ہے، اس کتاب کے فاضل مرتب نے اس قسم کی تاریخی و علمی دستاویزوں کے جمع و تدوین و اشاعت کا اہم بیڑہ اٹھا رکھا ہے، چنانچہ اس کتاب میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے ان مضامین کو یکجا کیا گیا ہے جو رسالہ برہان دہلی میں قریب نصف صدی قبل شایع ہوئے تھے ان کے علاوہ مولانا گنگوہی کا ایک فتوی اور مولانا سید محمد میاں کا ایک مضمون بھی بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے، خود محقق مرتب کے قلم سے ایک مبسوط و مفصل مقدمہ بھی ہے، تقسیم ہند و نظریۂ پاکستان کے متعلق ان کا مخصوص نقطۂ نظر ہے، اس مقدمہ میں بھی اس کا اظہار جرأت سے

کیا گیا ہے۔

میخانۂ حرف از جناب تاباں نقوی امروہوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۳۰، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

یہ کتاب ذخیرۂ غالبیات میں ایک اور اضافہ ہے، اس میں غالب کے فارسی شعر و ادب کے جمالیاتی پہلو کا جائزہ اس احساس کے پیش نظر لیا گیا ہے کہ بدو فطرت سے غالب کی طبیعت کو فارسی زبان سے لگاؤ تھا، انہوں نے کم و بیش نصف صدی تک فارسی زبان میں اپنی فکر کے چراغ روشن کیے، اس اجمال کی تفصیل میں غالب کے عشق فارسی، اس باب میں ان کی خود شناسی اور ان کے کلام منظوم و منثور کے محاسن کے علاوہ سرزمین فارس میں غالب کی قدردانی کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، پر از معلومات مباحث کے علاوہ نمایاں خوبی کتاب کا طرز نگارش ہے، شستہ و شائستہ تحریر نے مضامین کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے، غالبیات کے قدرشناسوں کے لیے اس میں لطف و لذت کا خاصا سامان ہے۔

زنداں کا داعی از جناب مولانا انعام الرحمٰن خاں بھوپالی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۹۴، قیمت ۵۴ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی ۶

مولانا انعام الرحمٰن خاں مرحوم ہندوستان کی جماعت اسلامی کے اولین اراکین و قائدین میں تھے، خلوص، دردمندی اور اعتدال و توازن کی وجہ سے ان کو ہر طبقہ میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، ہندوستان کی آزادی کے فوراً بعد جماعت اسلامی پر شدائد و محن کا ایک دور گزرا، ۱۹۵۳ء میں اس کے متعدد راہ نما اور کارکن پابند سلاسل ہوئے، مولانا بھی

ان میں شامل تھے، قید کے اس عرصہ میں انہوں نے ڈائری کی شکل میں اپنے احساسات قلم بند کیے، اسی روداد قفس کو زیر نظر کتاب کی شکل میں شایع کیا گیا ہے، سادہ بے ساختہ اور بے تکلف تحریر کا یہ عمدہ نمونہ ہے جس میں اسلام اشتراکیت، جمہوریت، عقل و عشق اور تصوف کے رموز پر بھی نکتے کی باتیں آگئی ہیں، خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ان کے خیالات دلچسپ ہیں، البتہ کتاب و صاحب کتاب کے تعارف میں ۱۹۵۳ء کی اس روداد کو ایمرجنسی (۱۹۷۵ء) کے دور سے منسوب کر دیا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔

صدائے شکستِ دل از جناب نثار جیراجپوری، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور طباعت، مجلد، صفحات ۱۴۴، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶ اور نصرت پبلیکیشنز، حیدری مارکیٹ، لکھنؤ، یوپی۔

اردو کے شعری مجموعوں کے سلسلہ کی یہ نئی کڑی اور شاعر کی خوش فکری و خوش گوئی کا اچھا نمونہ ہے، حمد و دعا کے علاوہ قریب ۸۰ غزلیں ہیں، بادل، کبوتر، گنبد، حویلی، پتے، طاق، جھیل، دریا، سمندر، ساحل، سرخاب، شکارا، شام، شوالہ اور دھانی رنگ جیسی علامتوں اور تشبیہوں کی تکرار سے شاعر کے ذہن اور اس کے شعری ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، جس سے تحیر، معصومیت، گم شدگی اور خود فراموشی کی پرکیف فضا کا احساس ہوتا ہے، قدیم آہنگ میں جدید رنگ کی آمیزش صاف نظر آتی ہے اور یہ دلکش بھی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اک سراپا نور تھا بجھتا بھلا وہ کس طرح — کر رہی تھی غار میں جس کی نگہبانی ہوا

آئے بادل اور برس کے چل دیے — رات بھر ٹپکا کیے پتے تمام

سبھی اعمال اس کے کافرانہ — مگر لگتا ہے شکلاً اک عرب سا

معنوی محاسن کے ساتھ ظاہری پیکر بھی نفیس و جاذب نظر ہے اور جناب کیفی اعظمی، پروفیسر شمیم حنفی اور ڈاکٹر اشفاق اعظمی کے تاثرات بھی شامل کتاب ہیں۔

ع۔ص